ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی
اس شمارے کے ساتھ اسٹیکر کا تحفہ ضرور حاصل کریں
اگست ۱۹۹۴ء
ایک سنسنی خیز کہانی
مجرم کا ہاتھ
جس نے اُس کا جینا دوبھر کر دیا تھا
جب خواب بکھر جائیں

احمد
کسٹرڈ
ذائقہ ایسا کہ خوب کھائیں
قیمت ایسی کہ روز لے آئیں
AHMED
CUSTARD
POWDER
Vanilla
Mango
Banana
Net Wt. 300 g. (10.6 oz.)
اسٹرابیری
بنانا
مینگو
ونیلا
خوب کھائیں روز لائیں!
قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا

Adarts-SAF-1/93

حبیب بینک
کے کھاتے دار اَب
ہر دِن کے ۲۴ گھنٹے
اور سال کے ۲،۶۵ دِن
نقد رقوم نکلوا سکتے ہیں۔

حبیب بینک نے زیادہ سے زیادہ
لوگوں کو سیلف سروس بینکنگ
کی سہولت فراہم کرنے کے لئے
آٹو کیش مشینیں نصب کی ہیں۔

ہماری آٹو کیش مشینیں اس وقت کراچی،
لاہور، اسلام آباد، راولپنڈی، پشاور
اور فیصل آباد میں کام کر رہی ہیں۔

اے ٹی ایم کارڈ حاصل کرنے کے لئے آج ہی اپنے برانچ منیجر سے رجوع کیجیے۔

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۲

صفر/ربیع الاوّل ۱۴۱۵ھ اگست ۱۹۹۴ء

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ
تجمل حسین چشتی

منیجنگ ایڈیٹر
ایم اے فاروقی

مدیر اعزازی
طاہر مسعود

مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

سرکولیشن منیجر
بابر فاروقی

مصوّر
مومن رحیم

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ تحریری اجازت کے بغیر ان کو دوبارہ شائع نہیں کیا جا سکتا۔
ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضیاء الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافہ اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے شائع کیا ہے۔

قیمت ۱۲ روپے
۷ درہم ۷ ریال

فون: ۴۹۴۲۸۵۷
خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ڈی-۱ پی آئی بی کالونی کراچی ۵ (۷۴۸۰۰)

ناشر: ظفر محمود شیخ - طابع: زاہد علی - مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

سات برس کے بعد

آنکھ مچولی کا خاص نمبر

انوکھے انداز میں، بہترین پیش کش کے ساتھ

ستمبر ۹۴ء میں
منظرِ عام پر آرہا ہے

- دلچسپ پُر تجسّس کہانیاں
- مقبول شاعروں کی نظمیں
- آپ کی پسندیدہ شخصیتوں کے انٹرویو
- پڑھنے والوں سے مزیدار سروے
- رنگین تصویری فیچر
- دُوسرے سیاروں کے قصّے
- مہم جُوئی کے واقعات
- ہنستے ہنساتے تفریحی ڈرامے
- شکاریات کی دُنیا
- کھیل کے میدان
- گدگداتے ہوئے کارٹون
- کھلکھلاتے ہوئے لطیفے
- اور ہمک پارے جو ہر دوسرے صفحے پر بکھرے ہوں گے

قہقہہ بھی، سنجیدگی بھی

حیرت بھی اور دہشت بھی

آپ بھی لکھیے

ہر قابلِ اشاعت تحریر کا معاوضہ دیا جائے گا
موضوع کی کوئی پابندی نہیں ہوگی

پورا رسالہ رنگ برنگی تحریروں، تصویروں اور دلچسپ سلسلوں سے مزیّن ہوگا

تحریریں بھیجنے کا پتا: مدیر اعزازی آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی کراچی

حسنِ ترتیب

سنہرے حروف ــــــ محمد فاروق ــ ۸

ماہِ رواں کی پہلی بات ــــــ اداریہ ــ ۹

حمدِ باری تعالیٰ (نظم) ــــــ ایم یاسین آرزو ــ ۱۰

اے اللہ مجھے شہادت نصیب کر ــــــ زبیر طارق ــ ۱۱

مُجرم کا ہاتھ ــــــ محمد عادل منہاج ــ ۱۵

ٹی وی کی مکھی ــــــ محمد عظیم قریشی ــ ۲۴

جب خواب بکھر جائیں ــــــ حسن فرخ ــ ۲۸

چودہ اگست (نظم) ــــــ زاہدالحسن زاہد ــ ۳۴

عزم کی فتح ــــــ خان اکبر علی خان ــ ۳۵

مقابلۂ چیخ و پکار ــــــ محمد بن مالک ــ ۳۸

سوال یہ ہے ــــــ ایاز محمود ــ ۴۲

دیوارِ برلن ــــــ ن یاسین ــ ۴۶

اور بھوک مر گئی ــــــ منیر احمد راشد ــ ۴۹

ہنستے ہنستے ــــــ لطائف ــ ۵۶

ہم اخبار کیوں نہیں پڑھتے ــــــ علیم افضل ــ ۶۰

اندھیرے غاروں کا سفر ــــــ ریحانہ منیر ــ ۶۵

عکس ادھورے ــــــ ادارہ ــ ۶۸

بی لومڑی اور میاں کوے (نظم) ــــــ شان الحق حقی ــ ۷۲

قرض کی خاطر ــــــ اعجاز احمد ــ ۷۴

چار اور ایک ــــــ آفتاب احمد ــ ۸۳

چیتو میاں نے دعوت اڑائی (نظم) ــــــ عبدالقادر ــ ۸۵

شا کامرخی کی پٹائی ــــــ نعیم مشتاق زومی ــ ۸۶

آمنے سامنے ــــــ سلیم خالق ــ ۹۲

بنام آنکھ مچولی ــــــ خطوں کے جواب ــ ۹۵

بارش کب کیسے کہاں اور کتنی؟ ــــــ نگہت احسان ــ ۹۹

میں اس کی یہ میری بہنا (نظم) ــــــ محمد جاوید خالد ــ ۱۰۱

سب کا بادشاہ ــــــ عنبرین ناظر چوہان ــ ۱۰۳

بیٹیرا، ایجادات کی ماں ــــــ عبدالستار خان طاہر ــ ۱۰۵

وہ کیا راز تھا ــــــ محمد عمر احمد خان ــ ۱۰۸

قلم دوست ــــــ ننھی تحریریں ــ ۱۱۵

سنہرے حروف

یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ ایک بچہ سڑک کے کنارے چلا جا رہا تھا۔ اچانک پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی نے اسے ٹکر مار دی۔ بچے کے سر سے خون بہنے لگا اور وہ رونے لگا۔ ایک ہندو کا ادھر سے گزر ہوا۔ ایک مسلمان بچے کو روتا دیکھ کر طنزاً اس نے کہا "مسلمان ہو کر روتے ہو!" بچے نے یہ سن کر جواب دیا۔ "میں اس لئے رو رہا ہوں کہ جو خون میں نے پاکستان کے لئے بچا رکھا تھا، وہ اب سڑک پر بے کار ضائع ہو رہا ہے۔"

قائد اعظمؒ نے اس واقعے کو سن کر فرمایا! "جس قوم میں ایسے بچے پیدا ہو جائیں اسے زیادہ دیر محکوم نہیں رکھا جا سکتا۔"

محمد فاروق، لیہ

ماہِ رواں کی

پہلی بات

آزادی حاصل کرنا آسان نہیں۔ آزادی بڑی جدوجہد کے بعد ملتی ہے۔ لیکن جب آزادی مل جاتی ہے تو اسے صحیح مقاصد کے لئے استعمال کرنا بھی ضروری ہوتا ہے اور اس کے لئے بہت ہوش مندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آزادی کا ذمہ داری کے بغیر کوئی تصور نہیں ہے۔ آزادی ایک نعمت ہے لیکن احساس ذمہ داری نہ ہو تو یہ ایک لعنت ہے۔ جس قوم کے لوگ آزادی حاصل کر کے بے لگام ہو جاتے ہیں اور کسی قانون اور ضابطے کی پابندی کرنے پر تیار نہیں ہوتے وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوتے ہیں اور اپنی ہی حماقتوں سے اپنی آزادی سے محروم بھی ہو جاتے ہیں۔

ہم نے ۴۷ سال پہلے آزادی حاصل کی تھی۔ اس عرصے میں ہم نے زندگی کے بہت سے شعبوں میں ترقی کی ہے۔ آزادی کے وقت ہمارے حصے میں ایک کمزور اور تباہ حال ملک آیا تھا لیکن ہم نے محنت اور عزم و ہمت سے اسے ایک مضبوط اور خوش حال ملک بنا دیا۔ ہمارا ملک اور ترقی کرتا اگر اسے اچھی قیادت میسر آتی ۔۔۔ اچھے اور مخلص لیڈروں کے نہ ہونے سے ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ یہاں تک کہ ہم نے ملک کا ایک حصہ کھو دیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں اچھے لیڈر کیوں نہ ملے ۔۔۔ اس لئے کہ شاید ہم خود اچھے نہیں رہے تھے۔

ذرا سوچئے ہم میں سے کتنے ہیں جو ہر حال میں قانون کی پابندی کرتے ہیں، ملک کے فائدے کا خیال رکھتے ہیں، اپنے فرائض کو ذمہ داری کے ساتھ پورا کرتے ہیں۔ جب ہم لوگ ہی ملک کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوں تو لیڈروں کی شکایت کس منہ سے کریں۔

ظاہر ہے ہمارے لیڈر آسمان سے تو اترے نہیں ہیں، وہ بھی ہمارے ہی جیسے ہیں۔ چنانچہ جیسے ہم ہیں ویسی ہماری حکومت ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو درست کر لیں تو حکومت بھی اور ہمارے لیڈر بھی درست ہو جائیں گے اور اگر وہ ٹھیک نہ بھی ہوں تو ملک کا آدھا نظام تو ٹھیک ہو ہی جائے گا۔

آج ملک میں انتشار اور افراتفری کی کیفیت ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے آزادی کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ ہم نے یہ سمجھ لیا کہ چونکہ ہم آزاد ہیں اس لئے ہم پر کوئی قانون کوئی ضابطہ نافذ نہیں ہو سکتا۔ قانون شکنی ہمارے مزاج میں داخل ہو گئی ہے حالانکہ قانون ہوتا ہی اس لئے ہے کہ ہماری آزادی محفوظ رہے۔ آج وہی قومیں ترقی یافتہ ہیں جہاں قانون کی حکمرانی ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم ہر حال میں قانون کا احترام کریں۔ کیونکہ اسی طرح ہم آزاد رہ سکتے ہیں۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

حمد باری تعالیٰ

ایم یاسین آرزو

رحمان مولا سلطان مولا
تیرے میں صدقے قربان مولا

تعریف تیری توصیف تیری
کیسے بیان ہو
ہر ایک ذرے ہر ایک پتے
سے تم عیاں ہو

یہ چاند تارے شبنم شرارے
شہکار تیرے
کوئی نہ جانے کوئی نہ سمجھے
اسرار تیرے

تو ہی گلابوں تو ہی سحابوں[لہ]
میں جلوہ گر ہے
چھوٹے بڑے پر کھوٹے کھرے پر
تیری نظر ہے

ادنیٰ اور اعلیٰ ہر ایک بندہ
محتاج تیرا
جن و بشر پر ہر اک نگر پر
ہے راج تیرا

حکمت ہے ساری تصنیف تیری
قرآن مولا
یاسین کہہ دے تیرے میں صدقے
قربان مولا

لہ بادل

اے اللہ مجھے شہادت نصیب کر

تحریر: ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت پاشا
ترجمہ: زبیر طارق

ان کے بال پراگندہ اور جسم دُبلا اور کمزور تھا مگر وہ بلا کے پھرتیلے تھے۔ طاقت کا یہ حال کہ سینکڑوں مشرکین کا تنہا مقابلہ کیا اور انہیں انجام تک پہنچایا۔ شہسوار تھے۔ دلیر اتنے کہ لڑائی میں سب سے آگے رہتے۔ ان کی اس خطرپسند طبیعت کے باعث حضرت عمرؓ نے اپنے عمال کو ہدایت بھیجی کہ انہیں کسی لشکر کی کمان نہ سونپی جائے۔ انہیں خدشہ تھا کہ ان کی جلد بازی مسلمانوں کو ہلاکت میں نہ ڈال دے۔

یہ تھے خادمِ رسولؐ انسؓ بن مالک کے بھائی براءؓ بن مالک انصاری۔ ان کی شجاعت اور بہادری کی داستانیں انتہائی طویل ہیں۔ چند محدود صفحات میں ان سب کا بیان ممکن نہیں۔ ان کی شجاعت کا صرف ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔

اس قصے کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ہوتا ہے۔ آپؐ کے وصال کے بعد قبائلِ عرب اسلام سے اسی طرح نکلنے لگے جیسے وہ فوج در فوج اس میں داخل ہوئے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان میں سے کوئی بھی اسلام پر باقی نہ رہا۔ مکہ، مدینہ اور طائف کے لوگ یا چند متفرق گروہ جن کے دلوں میں ایمان کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں، اسلام پر ثابت قدم رہے۔

اس فتنۂ ارتداد کے مقابلے میں حضرت ابو بکر صدیقؓ ایک مضبوط چٹان ثابت ہوئے۔ انہوں نے مہاجرین و انصار کے گیارہ لشکر ترتیب دیئے اور انہیں جزیرۂ عرب کے مختلف گوشوں میں روانہ فرمایا۔ ان لشکروں کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ مرتدین کو حق اور ہدایت کی راہ پر واپس لائیں اور اس کام

کے لئے انہیں تلوار اٹھانا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کریں۔

ان مرتدین میں مسیلمہ کذاب کا گروہ، بنو حنیفہ بہادری اور کثرت میں سب سے نمایاں تھا۔ مسیلمہ کے پاس چالیس ہزار افراد کا بھاری لشکر تھا۔ اس لشکر میں بنو حنیفہ کے علاوہ دیگر دوست قبائل کے افراد بھی شامل تھے۔ ان تمام لوگوں کو جاہلی عصبیت مسیلمہ کے پاس کھینچ لائی۔ عرب صدیوں سے اس فتنے میں مبتلا تھے۔ اسلام سے قبل جاہلی اصول یہ تھا کہ ہر حال میں اپنے قبیلے کا ساتھ دو خواہ وہ حق پر ہو یا ظالم۔ عصبیت کے اس اصول پر وہ سب مسیلمہ کے پرچم تلے آ جمع ہوئے۔ ان میں سے اکثر نے اس کی جھوٹی نبوت کو بھی نہیں مانا۔ بعض نے تسلیم کیا: "ہم جانتے ہیں کہ مسیلمہ جھوٹا ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں ..... لیکن ربیعہ (مسیلمہ کا قبیلہ) کا جھوٹ مضر (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ) کے سچ سے ہمیں زیادہ پسند ہے۔"

مسلمانوں کی پہلی فوج عکرمہؓ بن ابی جہل کی قیادت میں بنو حنیفہ کا مقابلہ کرنے گئی۔ مگر اسے مسیلمہ کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی۔ اس کے بعد ابو بکر صدیقؓ نے خالد بن ولیدؓ کی کمان میں دوسری فوج روانہ کی۔ اس فوج میں مہاجرین و انصار کے بڑے بزرگ اور نامور صحابہ بھی شریک تھے۔ ہراول دستہ براءؓ بن مالک اور ان جیسے دلیر شہسواروں پر مشتمل تھا۔

نجد میں یمامہ کے مقام پر دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ جنگ چھڑے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مسیلمہ کا لشکر حاوی ہونے لگا۔ مسلمان فوج کے قدموں تلے سے زمین کھسکنے لگی اور وہ اپنے مقام سے ہٹنا شروع ہو گئے۔ مسیلمہ کی ایک جماعت خالد بن ولیدؓ کے خیمے تک جا پہنچی اور اسے اکھاڑ پھینکا۔ قریب تھا کہ وہ ان کی اہلیہ کو قتل کر ڈالیں کہ انہی میں سے ایک شخص نے ان کو پناہ دی۔

اب مسلمانوں میں شدید خطرے کا احساس جاگا۔ وہ جان گئے کہ مسیلمہ کے ہاتھوں شکست کا مطلب ہے آج کے بعد اسلام باقی نہ رہے اور جزیرہ عرب میں اللہ ـــــ جو ایک ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ـــــ کی عبادت ختم ہو جائے۔

حضرت خالدؓ نے اپنا لشکر دوبارہ منظم کیا۔ مہاجرین، انصار اور بدو قبائل کو الگ الگ جماعتوں میں تقسیم کر کے ایک پرچم تلے جمع فرمایا۔ آپ چاہتے تھے کہ اس طرح ہر گروہ خوب بہادری اور دلیری سے لڑے۔

گھمسان کی جنگ دوبارہ شروع ہو گئی۔ مسلمانوں کو اس قدر سخت معرکہ سے پہلی بار واسطہ پڑا۔ مسیلمہ کا لشکر پہاڑ کی مانند جما ہوا تھا۔ ان کی لاشوں کا ڈھیر لگ گیا مگر وہ قطعاً خوفزدہ نہ ہوئے۔ مسلمانوں نے شجاعت کی حیرت ناک مثالیں قائم کیں۔

یہ ثابتؓ بن قیس ہیں ـــــ انصار کے علمبردار

انہوں نے خوشبو لگائی، کفن باندھا اور اپنی نصف پنڈلی تک گڑھا کھود کر اس میں اتر گئے۔ ثابتؓ نے پرچم کو سرنگوں ہونے سے بچانے کے لئے انتہائی دلیری کا ثبوت دیا اور بالآخر شہادت کے درجے پر فائز ہوئے۔

وہ عمرؓ بن خطاب کے بھائی زیدؓ بن خطاب اعلان کر رہے ہیں: "لوگو! مضبوطی سے جم جاؤ اور دشمنوں کا صفایا کرتے آگے بڑھو۔ اے لوگو! سن لو۔ میں اس کے بعد تم سے کوئی لفظ نہیں کہوں گا یہاں تک کہ مسیلمہ شکست کھا جائے یا میں اللہ سے جا ملوں۔" پھر وہ پلٹ کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور ان سے لڑتے، انہیں قتل کرتے شہید ہو گئے۔

اور یہ ابو حذیفہ کے غلام سالمؓ ہیں۔ مہاجرین کا علم انہی کے پاس ہے۔ لوگوں کو خوف ہے کہیں وہ کمزور نہ پڑیں یا ان کے قدم نہ اکھڑ جائیں چنانچہ وہ ان سے کہتے ہیں: "ہمیں ڈر ہے کہ کہیں آپ کی وجہ سے ہمیں ہزیمت نہ اٹھانا پڑے۔"

"اگر ایسا ہو تو میں نہایت بُرا مسلمان ہوں گا۔" سالمؓ نے فرمایا اور اللہ کے دشمنوں پر شیر کی مانند جا پڑے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

ان سورماؤں کی بہادری اپنی جگہ مگر ان سب میں براءؓ بن مالک کا کارنامہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت خالدؓ نے جب دیکھا کہ معرکہ کارزار خوب گرم ہے تو انہوں نے براءؓ سے مخاطب ہو کر کہا: "اے انصار کے نوجوان! اپنی قوم کی خبر لو۔" یہ سن کر براءؓ نے اپنی قوم کو پکارا: "اے انصار! تم میں سے کوئی لوٹ کر مدینہ جانے کا تصور نہ کرے۔ آج کے بعد تمہارے لئے کوئی مدینہ نہیں..... بس ایک اللہ ہے..... یا پھر جنت....."

اس کے بعد براءؓ اپنی قوم کے ہمراہ مشرکین پر ٹوٹ پڑے اور دشمن کی صفوں میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ اپنی تلوار سے دشمنانِ خدا کی گردنیں اڑاتے چلے گئے۔ اس طوفانی حملے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسیلمہ اور اس کے لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ بھاگ کر اس باغ میں جا چھپے جو آج تاریخ میں حدیقۃ الموت (موت کا باغ) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ نام اس شدید خونریزی کے باعث پڑا جو اس روز اس باغ میں ہوئی۔

حدیقۃ الموت کے اندر ایک وسیع میدان تھا۔ اس کی دیواریں خاصی بلند تھیں۔ مسیلمہ اور اس کے ہزاروں ساتھیوں نے باغ میں گھس کر دروازے بند کر دیئے۔ اور اس کی بلند دیواروں پر مورچے بنا کر مسلمانوں پر تیروں کی بارش کر دی۔

اس موقع پر حضرت براءؓ نے ناقابل یقین دلیری کا مظاہرہ کیا۔ وہ آگے بڑھے اور مسلمانوں سے کہا:

"لوگو! مجھے کسی ڈھال پر بٹھا دو، پھر اسے اپنے نیزوں سے بلند کر کے باغ کے اندر دروازے کے قریب پھینک دو۔ میں یا شہادت پالوں گا ورنہ تمہارے لئے دروازہ کھول دوں گا۔"

حضرت براءؓ اپنے کمزور اور نحیف جسم کے ساتھ ڈھال پر بیٹھ گئے۔ دسیوں نیزوں نے انہیں باغ کے اندر اچھال دیا۔ براءؓ کی تلوار مشرکین پر بجلی کی مانند کوندی۔ اس حملے میں انہوں نے خود بھی اَن گنت زخم کھائے مگر بالآخر پورے پر متعین مرتدوں کو قتل کر کے دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ دروازے کا کھلنا تھا کہ مسلمانوں نے باغ پر یلغار کر دی اور اس کے در و دیوار سے طوفان کی مانند ٹکرا پڑے۔ ان کی تلواریں مرتدین کا صفایا کر رہی تھیں۔ باغ میں ہر سمت موت چھائی ہوئی تھی۔ بالآخر جنگ دشمن کی شکست فاش پر ختم ہوئی۔ اس خونریز معرکے میں تقریباً بیس ہزار مرتدین موت کے گھاٹ اترے۔ ان میں مسیلمہ کذاب بھی شامل تھا۔

اس خوفناک جنگ میں حضرت براءؓ بن مالک نے جس دلیری کا مظاہرہ کیا اس کے نتیجے میں ان کے جسم پر تیر اور تلوار کے اسّی سے زائد زخم آئے۔ جنگ کے بعد انہیں خیمے میں لا کر مرہم پٹی کی گئی۔ خالدؓ بن ولید خود ایک ماہ تک ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ نے انہیں شفا بخشی اور وہ صحت یاب ہو گئے۔ اس فتح کا سہرا بلاشبہ انہی کے سر تھا۔

حضرت براء بن مالک حدیقۃ الموت کے دن شہادت سے محروم رہے مگر انہوں نے اس کی تلاش ترک نہیں کی۔ اس دیرینہ آرزو کی تکمیل اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے شوق میں وہ تمام جنگوں میں شریک ہوئے۔ فارس کے شہر تستر کی فتح کے دن ایرانی لشکر ایک مضبوط قلعے میں داخل ہو گیا۔ مسلمانوں نے ان کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔ فارسی طویل ناکہ بندی سے عاجز آ گئے۔ انہوں نے قلعے کی فصیلوں سے تپتے ہوئے لوہے کی سرخ زنجیریں نیچے پھینکنا شروع کیں۔ ان کے سروں پر نوکیلے کانٹے لگے ہوتے۔ جیسے ہی زنجیر نیچے آتی، اس کے نوکیلے کانٹے کسی نہ کسی مسلمان سپاہی کے بدن میں گھس جاتے۔ مشرکین اسے اوپر کھینچ لیتے۔ اس دوران وہ شہید ہو جاتا یا تکلیف کی شدت سے موت کے قریب جا پہنچتا۔

ایسے ہی ایک پھندے نے براءؓ کے بھائی انسؓ کو اچک لیا۔ جیسے ہی حضرت براء نے یہ دیکھا وہ قلعے کی دیوار پر جا چڑھے اور زنجیر پکڑ لی۔ وہ اپنے بھائی کے بدن سے نوکیلے کانٹے نکالنے لگے۔ لوہے کی سرخ تپتی زنجیر سے ان کے ہاتھ کا گوشت جل رہا تھا اور اس سے دھواں اٹھ رہا تھا..... لیکن جب تک انہوں نے اپنے بھائی کو آزاد نہیں کرا لیا، زنجیر نہیں چھوڑی۔ جب وہ زمین پہ واپس اترے تو ہاتھ کا گوشت مکمل طور پر جل چکا تھا اور صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔

اس جنگ میں حضرت براءؓ نے دعا کی: "اے اللہ! مجھے شہادت نصیب فرما۔" اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور وہ شہادت کی دولت پا کر اپنے رب سے جا ملے۔

مجرم کا ہاتھ

محمد عادل منہاج

"ڈاکٹر مختار نے اس آپریشن میں واقعی اپنی سرجری کا کمال دکھایا ہے۔ یہ تو پہلے بھی ہوتا رہا ہے کہ ایکسیڈنٹ میں کسی کی ہڈی ٹوٹ گئی تو ڈاکٹروں نے اسے جوڑ دیا یا جسم کے کسی کٹے پٹے حصے کو ٹھیک کر دیا مگر آپریشن کی انفرادیت یہ تھی کہ ایکسیڈنٹ کے دوران نوجوان محسن علی کا ہاتھ کلائی کے پاس سے کٹ کر بالکل علیحدہ ہو گیا تھا اور ڈاکٹر مختار نے سرجری کے ذریعے کٹے ہوئے ہاتھ کو دوبارہ کلائی پر جوڑ دیا۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جو شاید اس سے پہلے کسی نے انجام نہیں دیا۔ اب میں محسن علی کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اسٹیج پر آکر بتائے کہ وہ کیسا محسوس کر رہا ہے؟"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک نوجوان کرسی سے اٹھا اور اسٹیج کی طرف آیا۔

"میں کس منہ سے ڈاکٹر مختار کا شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے مجھے زندگی بھر کے لئے معذور

ہونے سے بچالیا۔ میں جب اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہوں تو لگتا ہی نہیں کہ یہ میری کلائی سے کبھی الگ بھی ہوا تھا۔ میرا یہ ہاتھ بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے۔ ابھی میں اس سے بھاری وزن تو نہیں اٹھا سکتا۔ تاہم ڈاکٹر صاحب کے کہنے کے مطابق آہستہ آہستہ میں اس قابل بھی ہو جاؤں گا۔"

اس کے بعد اور لوگوں نے بھی اظہار خیال کیا۔ یہ تقریب فرمان علی نے اپنے بیٹے کے کامیاب آپریشن کی خوشی میں اور ڈاکٹر مختار کے اعزاز میں منعقد کی تھی۔ چند روز پیشتر اس کے بیٹے محسن علی کا کار ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور اس کا ہاتھ عین کلائی پر سے کٹ کر الگ ہو گیا تھا مگر ڈاکٹر مختار نے جو ایک کامیاب سرجن تھے، کٹے ہوئے ہاتھ کو کمال مہارت سے کلائی پر ایسے جوڑ دیا تھا کہ اب لگتا ہی نہیں تھا کہ کبھی محسن علی کا ہاتھ کٹا بھی تھا۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

"یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ڈاکٹر مختار نے اکرام بیگ کی بات سن کر حیرت سے کہا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ان سے ملنے آئے تھے اور انہوں نے بتایا تھا کہ اس کے بیٹے فراز کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور اس کا بایاں ہاتھ کچلا گیا ہے۔

"آپ نے کچھ عرصہ پیشتر ایسے ہی ایک ایکسیڈنٹ کیس میں ایک نوجوان کا ہاتھ دوبارہ جوڑا تھا۔" اکرام بیگ بے چینی کے عالم میں بول رہا تھا۔

"جی ہاں مگر اس نوجوان کا ہاتھ کلائی پر سے کٹ گیا تھا اور آپ کے بیٹے کا ہاتھ گو آپ کے کہنے کے مطابق بُری طرح کچلا گیا ہے، بالکل ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا اب کیا ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر مختار نے کہا۔

"کک۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی دوسرے شخص کا ہاتھ میرے بیٹے کو لگا دیا جائے؟" اکرام بیگ اٹک اٹک کر بولا۔

"یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ڈاکٹر مختار حیران رہ گئے۔

"کیوں ڈاکٹر صاحب.... ہو کیوں نہیں سکتا؟ آخر لوگوں کو دوسروں کی آنکھ، جگر دے اور دل بھی تو لگائے جاتے ہیں۔" اکرام بیگ نے کہا۔

"ہاں! مگر دوسرے انسان کا ہاتھ لگا دینا کس قدر عجیب بات ہے بھلا کوئی شخص اپنا ہاتھ کاٹ کر تو آپ کو دینے سے رہا۔"

"میں خدانخواستہ کسی زندہ شخص کے ہاتھ کی بات تو نہیں کر رہا۔ آخر لوگ مرنے کے بعد اپنی آنکھیں بھی تو عطیہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کوئی شخص مرنے کے بعد اپنا ہاتھ بھی عطیہ کر سکتا ہے۔"

"آنکھوں کا معاملہ اور ہے۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ کوئی شخص مرنے کے بعد بھی اپنا ہاتھ عطیہ کر دے۔ نہ ہی مرنے والے کے لواحقین یہ پسند کریں گے کہ ان کے عزیز کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ آپ صرف یہ

بتائیں کہ اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ کا عطیہ دینے پر راضی ہو جائے تو کیا آپ آپریشن کے ذریعے اسے میرے بیٹے کے بازو سے لگا دیں گے۔"

"مم..... میں نہیں جانتا۔ ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں..... یہ اپنی نوعیت کا انوکھا آپریشن ہو گا۔ محسن علی کا تو اپنا ہاتھ تھا جو جوڑا گیا۔ مگر دوسرے کا ہاتھ لگانے سے ہو سکتا ہے کہ کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں۔ آپریشن ناکام بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں رسک لینے کے لئے تیار ہوں ڈاکٹر صاحب۔ فراز میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں اسے معذور نہیں دیکھ سکتا۔ بس آپ آپریشن کرنے کے لئے رضامند ہو جائیے۔"

"ہوں..... ٹھیک ہے میں یہ تجربہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ ہاتھ کا بندوبست کریں۔ دو باتوں کا خیال رکھئے گا کہ جس شخص کا ہاتھ لیا جائے اس کا اور آپ کے بیٹے کا خون کا گروپ ایک ہو اور دوسرے یہ کام چوبیس گھنٹوں میں ہو جانا چاہئے۔ زیادہ وقت گزرنے کے بعد آپریشن ممکن نہ ہو گا۔"

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

"تمہیں ضرور وہم ہوا ہے۔" اکرام بیگ فراز کی بات سن کر حیران رہ گئے تھے۔ اس نے بات ہی عجیب کی تھی۔ چند دن پیشتر اس کے بائیں ہاتھ کا آپریشن ہوا تھا۔ اکرام بیگ نے نہ جانے کیسے ہاتھ کا بندوبست کیا تھا۔ اور ڈاکٹر مختار نے ایک بار پھر عجوبہ کر دکھایا تھا اور ایک اجنبی ہاتھ فراز کی کلائی سے جوڑ دیا تھا۔ تاہم اکرام بیگ نے اس بات کو خفیہ رکھا تھا کہ فراز کے کسی اور کا ہاتھ لگایا گیا ہے اس نے ڈاکٹر مختار سے بھی راز داری کا وعدہ لیا تھا۔ یوں سب لوگوں کو یہی معلوم ہوا تھا کہ فراز کا اپنا ہاتھ ہی جوڑا گیا ہے۔

ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے فراز کی صحت یابی کی خوشی میں دعوت دی۔ ڈاکٹر مختار نے دعوت میں شرکت سے معذرت کر لی تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ ان سے اس تجربے کے بارے میں پوچھیں اور انہیں جھوٹ بولنا پڑے۔ دعوت عروج پر تھی جب وہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ فراز میز کے قریب کھڑا دائیں ہاتھ سے پلیٹ میں چاول نکال رہا تھا کہ اس کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور قریب کھڑے سلمان کی جیب میں گیا۔ دو انگلیوں نے بہت مہارت سے سلمان کا بٹوہ نکال لیا اور فراز کی جیب میں منتقل کر دیا۔

فراز دھک سے رہ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ سب کیا تھا کیا اس نے خود سلمان کا بٹوہ اڑایا ہے... مگر نہیں۔ اس کا تو یہ ارادہ نہیں تھا۔ اس نے تو ایسا کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ پھر یہ..... یہ کیسے ہوا۔ اس کے ہاتھ نے اس کی خواہش کے برخلاف ایک عمل کیسے کر ڈالا۔ مگر نہیں..... یہ اس کا ہاتھ تو نہیں تھا۔ یہ تو کسی اور کا ہاتھ تھا جو اس کے جسم میں موجود تھا۔ مگر اب تو یہ اس کے جسم کا حصہ تھا پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جسم کا ایک حصہ انسان کے ارادہ کے بغیر ہی کوئی عمل کر ڈالے۔ اسی وقت

سلمان آگے بڑھا تو فراز نے گھبرا کر جیب سے بٹوہ نکالا اور بولا۔

"سس ..... سلمان یہ تمہارا بٹوہ گر گیا تھا۔"

"ہائیں۔ یہ میری جیب سے کیسے نکلا؟" وہ حیرت سے بٹوہ لیتے ہوئے بولا۔

"شاید تم نے ٹھیک سے نہیں رکھا تھا۔" فراز جلدی سے بولا۔

"ہاں ..... شاید!" سلمان نے بٹوہ دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

دعوت ختم ہونے کے بعد رات کو اس نے یہ واقعہ اپنے والد کو سنایا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو..... تمہیں ضرور وہم ہوا ہے۔" اکرام بیگ فراز کی بات سن کر حیران رہ گئے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہیں ابا جان۔ وہم کیسا؟ اس ہاتھ نے واقعی سلمان کی جیب سے بٹوہ نکالا تھا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ شاید تم ذہنی طور پر اس ہاتھ کو قبول نہیں کر سکے اور سلمان کی جیب سے بٹوہ بھی تم نے لاشعوری طور پر نکال لیا ہوگا۔ بعض اوقات انسان لاشعوری طور پر ایسے کام کر جاتا ہے جن پر بعد میں اسے حیرت ہوتی ہے۔"

"لیکن اس معاملے میں ایسا نہیں۔ میں ذہنی طور پر بیمار نہیں ہوں۔" فراز نے احتجاج کیا۔

"میں یہ کب کہہ رہا ہوں۔ میں نے کہا نا تم ذہنی طور پر ایک اجنبی کے ہاتھ کو قبول نہیں کر پائے۔ بس اس معاملے پر زیادہ سوچو مت۔ ریلیکس (Relax) کرو اور آرام سے سو جاؤ۔" اکرام بیگ نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور کمرے سے نکل گئے۔ مگر فراز اس مشورے پر عمل نہ کر سکا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا تھا کہ کیا واقعی اس نے یہ حرکت لاشعوری طور پر کی تھی.....؟؟؟

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

فراز نے تیزی سے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو پکڑا اور پیچھے کھینچنے لگا وہ بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا ـــــ دعوت والے واقعے کے بعد دو دن خیریت سے گزر گئے تھے اور فراز بھی مطمئن ہو گیا تھا کہ بٹوہ اڑانے والی حرکت اس نے واقعی لاشعوری طور پر کی تھی۔ آج وہ اپنے ایک دوست سے مل کر واپس گھر جا رہا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ اس کی موٹر سائیکل تیزی سے سڑک پر دوڑی جا رہی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ اچانک اسے سڑک کے کنارے ایک شخص کھڑا نظر آیا جو اسے رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ فراز نے موٹر سائیکل اس کے قریب لے جا کر روک دی۔

"کیا بات ہے بھائی؟" اس نے پوچھا۔

"صاحب بڑی دیر سے یہ ایڈریس تلاش کر رہا ہوں مل ہی نہیں رہا۔ آپ کو کچھ پتہ ہے؟" اس شخص نے کاغذ کا ایک پرزہ فراز کی طرف بڑھایا۔ فراز پرزہ لے کر اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں پڑھنے لگا اس دوران تیزی سے اس شخص کا ہاتھ

جیب میں گیا اور اگلے ہی لمحے پستول کی نال فراز کی پسلیوں میں چبھنے لگی۔

"نیچے اترو۔" وہ غرایا۔

"کیا مطلب! یہ تم کیا کر رہے ہو.....؟" فراز گھبرا گیا۔

"میں نے کہا ہے فوراً نیچے اترو۔ ورنہ موٹر سائیکل کے ساتھ ساتھ جان سے بھی جاؤ گے۔" اس نے غرا کر کہا۔

"یہ ..... یہ تم اچھا نہیں کر رہے۔" فراز موٹر سائیکل بند کرتا ہوا نیچے اتر آیا۔ وہ فطرتاً اتنا بہادر نہیں تھا اور پھر پستول کی موجودگی میں تو بہادری بھی دھری رہ جاتی ہے۔ پستول والے نے اسے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور خود موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ فراز پریشان نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ فراز کا بایاں ہاتھ تیزی سے فضا میں بلند ہوا اور کراٹے کا ایک بھرپور وار پستول والے کے ہاتھ پر ہوا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا اور وہ درد کی شدت سے اپنا ہاتھ پکڑ کر رہ گیا۔ فراز حیرت زدہ رہ گیا تھا کہ یہ سب کچھ اس نے کیا ہے.....! مگر ابھی تو حیرتوں کے مزید پہاڑ ٹوٹنا تھے۔ فراز کا ہاتھ اب تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے پستول والے کی گردن دبوچ لی اور دباؤ ڈالتا چلا گیا۔ پستول والا بوکھلا گیا۔ اس کی آنکھیں باہر کو ابلنے لگیں وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے فراز کا ہاتھ پکڑ کر گردن چھڑانے لگا۔ ادھر فراز کے بھی ہوش اڑ گئے تھے۔

اس نے تیزی سے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو پکڑا اور پیچھے کھینچنے لگا۔ وہ بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اب پستول والے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اپنا ہاتھ اس کی گردن سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نتیجتاً جلد ہی بایاں ہاتھ گردن سے ہٹ گیا۔ فراز کو ایک جھٹکا لگا اور وہ نیچے گر پڑا۔ ادھر پستول والا چند لمحے اسے خوفزدہ نظروں سے گھورتا رہا پھر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

فراز حیرت اور خوف سے اپنے بائیں ہاتھ کو گھورے جا رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ کو اوپر اٹھایا اور اسے غور سے دیکھا۔ اس میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر یہ سب کیا تھا ..... اب وہ دوبارہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ سلمان کا بٹوہ اڑانے کا واقعہ اس نے لاشعوری طور پر نہیں بلکہ اس ہاتھ نے کیا تھا۔ کیا یہ ہاتھ اپنی مرضی کا مالک ہے؟ کیا یہ اس کے کنٹرول میں نہیں ہے؟ ویسے تو وہ اس ہاتھ کو بھی اپنے دائیں ہاتھ کی طرح استعمال کرتا رہا تھا اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر یہ واقعات کس بات کی نشاندہی کر رہے تھے!!

وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ اسی وقت اس کی نظر زمین پر پڑے پستول پر پڑی۔ اس نے کچھ سوچ کر پستول اٹھا لیا اور موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ اس کا گھر اب قریب ہی تھا۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

ایک زناٹے دار تھپڑ فراز کے منہ پر لگا۔ اس کا چہرہ گھوم گیا۔ اکرام بیگ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے فراز کے بائیں ہاتھ کو گھور رہے تھے۔

جب گھر آکر فراز نے سارا واقعہ اکرام بیگ کو سنایا اور پستول والے کا پستول ان کے سامنے رکھا تو وہ الجھن میں پڑ گئے۔

"کیا اب بھی آپ اسے میرے لاشعور کا واقعہ قرار دیں گے..... اف خدا! وہ شخص تو مرتے مرتے بچا ورنہ آج میں اس ہاتھ کے ہاتھوں قاتل بن گیا ہوتا۔" فراز کانپتی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"نہیں اب میں تمہاری بات نہیں جھٹلا سکتا مگر میں حیران ہوں یہ سب کیا ہے..... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ ہاتھ اپنی مرضی سے کام کرے۔ ایک ہاتھ میں تو عقل نہیں ہوتی۔ عقل تو انسان کے پاس ہوتی ہے جس سے کام لے کر وہ اپنے اعضا کو استعمال کرتا ہے اور..... اور یہ ہاتھ تمہاری مرضی کے خلاف کام کر رہا ہے۔" اکرام بیگ پریشان آواز میں بولے۔

"کچھ بھی ہو ابا جان..... اب کچھ کریں۔ مجھے اس ہاتھ سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔ یہ کسی دن مجھے پھانسی کے تختے پر پہنچا دے گا۔ کاش آپ نے مجھے معذور رہنے دیا ہوتا یا اس کی جگہ لکڑی کا یا مشینی ہاتھ لگوا دیا ہوتا....."

"اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسی انہونی ہو سکتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اب کیا کریں؟"

"آپ..... آپ اس ہاتھ کو آپریشن کے ذریعے الگ کروا دیں۔" فراز دھڑکتے دل کے ساتھ بولا۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کا بایاں ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور ایک زناٹے دار تھپڑ فراز کے منہ پر لگا اس کا چہرہ گھوم گیا۔ اکرام بیگ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے فراز کے بائیں ہاتھ کو گھور رہے تھے۔

"آپ..... آپ نے دیکھا ابا جان..... یہ..... یہ ہاتھ ہماری باتیں سمجھ رہا ہے۔" فراز کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو فراز..... یہ ہاتھ تمہاری زندگی کے لئے خطرہ ہے۔ اسے دور کرنا ہی ہوگا۔" وہ تیزی سے اٹھے اور ڈاکٹر مختار کے نمبر گھمانے لگے۔

○.....○.....○.....○

"مم..... مجھ بچاؤ....." ڈاکٹر مختار کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہ یہاں پہنچے تھے اور اکرام بیگ کی زبانی ساری کہانی سن کر حیران رہ گئے تھے!!

"جو کچھ آپ نے بتایا ہے اگر یہ سچ ہے تو میری زندگی کا حیران کن واقعہ ہے۔" انہوں نے کہا۔

"یہ سو فیصد سچ ہے ڈاکٹر صاحب۔ خدا کے لئے میرا پیچھا اس ہاتھ سے چھڑا دیں۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔" فراز روہانسی آواز میں بولا۔

"بظاہر تو اس ہاتھ میں ایسی کوئی بات نظر نہیں

آتی۔" ڈاکٹر مختار نے اس کا بایاں ہاتھ پکڑا تو ہاتھ نے ایکدم ان کی گردن دبوچ لی۔ ڈاکٹر مختار بوکھلا گئے۔ ان کا سانس سینے میں اٹکنے لگا۔

"مم ..... مجھے بچاؤ۔" ان کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ فراز اور اکرام بیگ بھی گھبرا گئے۔ دونوں مل کر ہاتھ ان کی گردن سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ بڑی مشکل سے ہاتھ الگ ہوا تو ڈاکٹر مختار اپنی گردن مسلتے ہوئے تیزی سے پیچھے ہٹ گئے۔

"بیگ صاحب آپ میرے ساتھ ذرا دوسرے کمرے میں آئیں۔" وہ بولے۔ دونوں فراز کو اس کمرے میں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آگئے۔

"یہ تو بتائیں آپ نے یہ ہاتھ حاصل کس طرح کیا تھا؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ ..... یہ ہاتھ دراصل ایک جرائم پیشہ شخص کا تھا۔" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔

"جرائم پیشہ شخص کا.....!" ڈاکٹر مختار دھک سے رہ گئے۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب آپ ٹھیک کہتے تھے کہ کوئی بھی شخص اپنے عزیز کا ہاتھ دینے پر راضی نہیں ہوگا۔ ایسا ہی ہوا تھا مگر ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے اور میری دیوانگی مجھے ایک جرائم پیشہ شخص تک لے گئی جس کے بھائی کا اسی دن انتقال ہوا تھا اس کا بھائی بھی جرائم پیشہ ہی تھا۔ وہ ایک بڑی رقم کے عوض اپنے بھائی کا ہاتھ دینے پر راضی ہو گیا....."

"اور آپ نے ایک مجرم کا ہاتھ اپنے بیٹے کے لگوا لیا۔"

"ہاں ..... کیا کرتا میں بیٹے کی محبت سے مجبور تھا اور پھر مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ سب ہوگا۔ بھلا سوچئے کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ مجرم کا ہاتھ مجرمانہ حرکتیں کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ تو بے جان چیز ہے۔ جب وہ میرے بیٹے کے جسم کا حصہ بن گیا تو وہ مجرمانہ حرکتیں کیسے کر سکتا ہے بھلا ہاتھوں میں بھی عقل ہوتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کام کرے۔"

"یہ بات میرے لئے بھی عجیب ہے مگر خیر دنیا میں بہت سے ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں جنہیں عقل تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے مگر ان کی حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی۔"

"اب تو ہاتھ ہی کو الگ کرنا ہوگا!!"

"ہاں ..... یہ تو کرنا ہی ہوگا۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہاتھ یہ برداشت نہیں کرے گا کہ اسے الگ کیا جائے۔ آپ نے دیکھا نہیں ابھی کس طرح اس نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ بھلا وہ مجھے آپریشن کب کرنے دے گا۔"

"پھر ..... پھر کیا ہوگا؟" اکرام بیگ پریشان ہو گئے۔

"میرا خیال ہے آپریشن سے پہلے دواؤں کے ذریعے اس ہاتھ بلکہ پورے بازو کو سُن کرنا ہوگا تاکہ یہ حرکت کرنے کے قابل نہ رہے لیکن سُن کرنے کے لئے دوا لگانا بھی مسئلہ ہے۔ ہاتھ اس کے

خلاف مزاحمت کرے گا۔ لہٰذا یوں کرنا ہو گا کہ دو تین لوگ مل کر فراز کو اور اس کے ہاتھ کو قابو میں کر لیں اور دوا لگا دیں۔ "

"بالکل ٹھیک۔ یہی مناسب رہے گا۔ " اکرام بیگ جلدی سے بولے۔

"تو پھر آپ چند لوگوں کا بندوبست کریں جو خاصے طاقتور ہوں اور انہیں ہاتھ کے بارے میں پہلے ہی بتا دیں ورنہ عین موقع پر وہ خوفزدہ ہو جائیں گے۔ "

"ٹھیک ہے...... میں اپنی فیکٹری سے چند قابل اعتماد اور بہادر ملازموں کو بلوا لیتا ہوں۔ "

"بس پھر کل آپریشن کر دیا جائے گا۔ آپ صبح صبح ہی ہسپتال پہنچ جائیں۔ " ڈاکٹر مختار اٹھ کھڑے ہوئے۔

○ .... ○ .... ○ .... ○

دھیرے دھیرے فراز کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ ہاتھ آہستہ آہستہ فراز کی گردن کی طرف بڑھا اور گردن پکڑ لی۔ ایک دم فراز کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ہاتھ گردن سے پھیل کر نیچے گر پڑا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور اکرام بیگ اندر داخل ہوئے۔

"کیا ہوا فراز؟ خیر تو ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ابا جان...... اس...... اس نے سوتے میں میرا گلا دبانے کی کوشش کی ہے۔ " وہ خوفزدہ آواز میں بولا۔

"کیا!!" ان کے منہ سے خوفزدہ انداز میں نکلا ...... " ٹھیک ہے۔ میں باقی رات تمہارے کمرے میں جاگ کر گزاروں گا۔ بلکہ میں ان تینوں ملازموں کو بھی یہیں بلوا لیتا ہوں۔ بس اللہ کرے یہ رات خیر خیریت سے گزر جائے۔ پھر ......" اکرام بیگ کہتے کہتے رک گئے۔ انہیں خوف محسوس ہوا تھا کہ کہیں وہ ہاتھ ان کے منصوبے سے واقف نہ ہو جائے۔ وہ تیزی سے ان ملازمین کو بلانے دوڑے۔ جنہوں نے کل اس کے ہاتھ کو قابو میں کرنا تھا۔ اکرام بیگ انہیں ساری تفصیل بتا چکے تھے۔

○ .... ○ .... ○ .... ○

ایک شخص نے فراز کو کمر سے پکڑ رکھا تھا۔ ایک نے بازو مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا جبکہ تیسرے نے اس کا ہاتھ کلائی کے پاس سے پکڑ رکھا تھا۔ ڈاکٹر مختار سرنج ہاتھ میں پکڑے آگے بڑھے۔

"تم لوگ تیار ہو۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔ " انہوں نے پوچھا۔

"بے فکر رہیں ڈاکٹر صاحب اور انجکشن لگا دیں۔ " ایک شخص بولا۔

"کیا ہاتھ حرکت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ "

"جی ہاں۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے پکڑا ہوا ہے۔ آپ فوراً کچھ کریں۔ " دوسرا شخص بولا۔

"ہوں۔ ہوشیار۔ بازو ہلنے مت دینا۔" وہ بولے۔ اگلے ہی لمحے سوئی اس کے بازو میں داخل ہو گئی۔ فراز نے آنکھیں بند کر لیں۔ سرنج کا محلول اس کے بازو میں منتقل ہونے لگا۔

"کیا اب بھی ہاتھ حرکت کر رہا ہے۔" انہوں نے سرنج نکالتے ہوئے پوچھا۔

"تھوڑی بہت حرکت اب بھی ہے ڈاکٹر صاحب۔"

"ذرا ہاتھ ہٹانا۔" وہ بولے اور اس شخص نے فراز کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس کے ہاتھ نے خفیف سی حرکت کی اور اوپر اٹھنے کی کوشش کی۔

"میرا خیال ہے۔ ایک انجکشن اور لگانا ہو گا۔" وہ بڑبڑائے۔

"کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" جونیئر ڈاکٹر بولا۔

"رسک تو لینا ہو گا۔" وہ بولے اور پھر ایک اور انجکشن اس کی کلائی کے قریب لگایا گیا۔ اس بار اس کا ہاتھ بالکل بے جان پڑا رہا۔

"کیوں فراز تم اپنے ہاتھ کو حرکت دے سکتے ہو۔" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے میرا بازو ہے ہی نہیں۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تو پھر آپریشن شروع کر دینا چاہئے۔" وہ بولے اور پھر فراز کو بے ہوش کر دیا گیا اور وہ ہاتھ جو کچھ عرصہ پیشتر لگایا گیا تھا، اسے الگ کرنے کا مرحلہ شروع ہوا۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

ڈاکٹر مختار نے حیران ہو کر اس رپورٹ کو پڑھا تھا مگر وہ کچھ سمجھ نہ سکے تھے۔ یہ معاملہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔

وہ ہاتھ فراز کے جسم سے الگ کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک مشینی ہاتھ لگا دیا گیا تھا جو ظاہر ہے کہ اصل ہاتھ کا بدل تو نہیں تھا مگر فراز نے سکون کا سانس لیا تھا۔ مجرم کا ہاتھ الگ کر کے ایک مرتبان میں رکھا گیا تھا جس میں ایک محلول تھا تاکہ ہاتھ خراب نہ ہو۔

ڈاکٹر مختار کا خیال اس پر تجربہ کرنے کا تھا کہ آخر اس نے یہ عجیب و غریب حرکت کس طرح کی۔ مگر جائزہ لینے پر چند عجیب باتیں سامنے آئیں۔

ہاتھ کی رپورٹ کے مطابق اس میں چند عجیب و غریب قسم کے جرثومے تھے مگر یہ کس قسم کے جرثومے تھے۔ اس کا پتہ نہیں چلایا جا سکا کیوں کہ جرثومے مر چکے تھے۔ ڈاکٹر مختار کافی عرصہ سوچتے رہے کہ کیا یہ جرثومے ہی تھے جو اس ہاتھ کو کنٹرول کر رہے تھے مگر وہ حقیقت کی تہہ تک نہ پہنچ سکے پھر کچھ عرصہ بعد وہ ہاتھ محلول میں ڈوبے رہنے کے باوجود سڑنا شروع ہو گیا اور ڈاکٹر مختار نے اسے مٹی میں دفن کروا دیا!!

ڈوبی مکھی

محمد عظیم قریشی

شام کا وقت تھا۔ ہماری بجیا اور اپیا، امی کے ساتھ آنٹی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ جاتے ہوئے اپنے بدتمیز اور شیطان قسم کے بچے ہمارے حوالے کر گئیں۔ ہم نے بڑا واویلا مچایا کہ ہمیں اسکول کا ہوم ورک کرنا ہے مگر کسی نے ہماری نہیں سنی۔ ان کے جانے کے بعد ہم بچوں کو ہانک کر اپنے کمرے میں لے آئے اور خود کیمسٹری کی کتاب پڑھنے لگے۔ بچوں کو اپنے سامنے رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ توڑ پھوڑ نہ کریں اور ہڑبونگ نہ مچائیں۔

ابھی ہمیں پڑھتے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک مکھی نے ہمیں تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کبھی ہمارے ناک پر آکر بیٹھ جاتی، کبھی کتاب پر۔ یکایک ہمارے ذہن میں ایک بات آئی..... کچھ دن پہلے ٹی وی پر ایک نیوز کاسٹر خبریں پڑھ رہا تھا تو ایک مکھی اسے بار بار تنگ کر رہی تھی۔ ہم اسے دیکھ کر

پھولے نہ سمائے (دراصل ہم اسے ٹی وی والی مکھی سمجھ بیٹھے تھے) اور فوراً طارق کو آوازی دی۔ اس کے پیچھے صہیب، فہمینہ اور عادل بھی دوڑے آئے۔

ہم نے طارق سے کہا کہ طارق! یہ ٹی وی والی مکھی ہے جو اس روز بار بار ٹی وی اسکرین پر نظر آرہی تھی۔

"اچھا!" طارق کی بجائے صہیب بول اٹھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی حیران نظر آرہا تھا۔ "کیوں نہ ہم اس مکھی سے آٹو گراف لے لیں؟" فہمینہ معصومیت سے بولی تو ہم سب ہنس پڑے۔ عادل نے کہا۔

"فہمینہ صاحبہ! یہ مکھی لکھنا پڑھنا کہاں جانتی ہے؟" عادل نے گویا اپنی عقلمندی کا ثبوت دیا۔

"چلو! پھر اسے البم میں لگا لیتے ہیں، سب کو بتائیں گے کہ یہ ٹی وی والی مکھی ہے۔" صہیب خوشی سے جھومتے ہوئے بولا۔

"نہیں صہیب! البم میں لگانے سے ای پٹائی کر دیں گی۔" عادل نے دوبارہ اپنی عقلمندی کا ثبوت دیا۔

"چلو پھر ایسا کرتے ہیں کہ اس کی تصویر کھینچ لیتے ہیں۔" صہیب نے پہلی مرتبہ تھوڑی عقل کی بات کی۔

سب نے ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔ پھر صہیب نے ہماری منت سماجت کرنی شروع کر دی کہ ہم عمر بھائی کا کیمرہ لائیں۔ مگر ہم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے کان میں جوں تک نہ رینگی۔

"تم اپنا کیمرہ کیوں نہیں لاتے؟" ہم نے گھورتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ہم بھائی کا کیمرہ لا کر ان کے غیظ و غضب کا شکار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ "اپنا کیمرہ اس لئے نہیں لا رہا کیونکہ بڑے کیمرے سے تصویر اچھی آئے گی۔ ہمارا تو پاکٹ کیمرہ ہے۔" صہیب نے گویا صفائی پیش کی۔

"مکھی بھی تو چھوٹی ہے، جاؤ بھاگ کر اپنا کیمرہ لے آؤ اور خبردار جو عمر بھائی کا کیمرہ لائے۔" ہم نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ (عملاً نہیں محاورتاً)

آخر کار صہیب اپنا کیمرہ لے آیا۔ ہم نے کیمرہ لے کر دیکھا تو مکھی ایسے غائب جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو میز پر مکھی کو بیٹھے پایا۔ ہم نے کیمرے میں سے پھر دیکھا۔ مگر مکھی غائب۔

"ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔" عادل نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم تصویر اتار لو۔" ہم نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ غصہ حرام ہوتا ہے۔

عادل نے ہمارے ہاتھ سے کیمرہ لے لیا۔

باقی بچے بالکل خاموش کھڑے تھے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ عادل کے کیمرہ لینے کے بعد

مکھی اڑ کر صہیب کے ہاتھ پر بیٹھ گئی۔ سب بچوں نے صہیب کو خبردار کیا۔

"صہیب! اسی طرح رہو، میں تصویر کھینچتا ہوں۔" عادل نے کہا۔

نفاست پسند صہیب نے ہاتھ ہلا دیا۔ میں ہنس پڑا۔ عادل نے کیمرہ ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے صہیب کو ایک شان دار ہاتھ جڑ دیا۔ اور دور جا کھڑا ہوا۔ صہیب بھاگا اور راستے میں کھڑے طارق کو دھکا دے کر گرا دیا۔ طارق نے اٹھنے کے بعد صہیب کی ٹھکائی کر دی۔ صہیب جو عادل کو مارنے جا رہا تھا، بھول کر طارق سے گتھم گتھا ہو گیا۔

فہمینہ اپنے بھائی طارق کی حمایت میں صہیب سے لڑنے لگی۔ طارق نے میز پر پڑا ہوا بڑا سا پیمانہ اٹھا لیا اور صہیب کو مارتا ہوا منہ سے عجیب و غریب آوازیں بھی نکالتا رہا۔

عادل کیمرہ میز پر رکھ کر ہنستا ہوا سامنے جا کھڑا ہوا وہ اب تک صہیب کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ صہیب نے اسے ہنستے دیکھ کر میز پر پڑا ہوا کیمرہ اس کے دے مارا۔ عادل سامنے سے ہٹ گیا۔ کیمرہ دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا۔

میں گھبرا کر کیمرے کی طرف بھاگا تو طارق نے ٹانگ آگے کر دی۔ وہ اکثر یہ شرارت کیا کرتا تھا اور تمام بچوں میں سب سے زیادہ شریر تھا۔ اس کا ٹانگ آگے کرنا تھا کہ میں دھڑام سے فرش پر آ گرا۔ گرتے وقت میرا سر میز کے کونے سے زور سے لگا اور خون بہنے لگا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اگرچہ میں اپنے آپ کو تیس مار خاں سمجھتا تھا۔ پھر بھی اس وقت بری طرح گھبرا گیا۔ سب بچے میری طرف متوجہ ہو گئے۔

"صہیب! اب کیا کریں؟" طارق نے رونی صورت بنا کر کہا۔

"اور شرارتیں کرو!" صہیب نے غصے سے کہا۔

"فہمینہ! اب کیا بھائی مر جائے گا۔"

یہ ہمارا دور اندیش بھتیجے عادل تھے۔ ہمیشہ دور کی باتیں سوچا کرتے تھے۔

میرے سر سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور کتنا ہی سارا فرش پر جمع تھا۔ میں خون دیکھ دیکھ کر گھبرا رہا تھا۔ عادل کی بات سن کر حقیقتاً بے ہوش ہو گیا۔

مجھے ہوش آیا تو میرے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور سب لوگ میرے ارد گرد موجود تھے۔ فہمینہ نے سارا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر سنایا تھا۔ سب نے طارق کو برا بھلا کہا اور آئندہ شرارتیں نہ کرنے کو کہا۔ طارق نے بھی شرارتیں کرنے سے توبہ کر لی۔ بیشک ٹانگ آگے کرنا یعنی اڑنگی دینا ایک چھوٹی سے شرارت ہے مگر بے حد درجے خطرناک۔ اس سے کسی کی جان بھی جا سکتی ہے۔

بچّوں کیلئے انمول تحفہ

ڈرامے، گیت، مزاحیہ خاکے، خبریں، معلوماتی پروگرام اور بہت بہت کچھ

فن کار: ظِل سبحان، نگہت بٹ، قاسم جیبی، جمشید انصاری، لطیف منا، نجیب اللہ انجم، شاہد اسماعیل اور بہت سے دوسرے۔
موسیقی: ارشد محمود، پروڈیوسر: ظفر محمود شیخ، ہدایات: سلیم مغل، اظہر نیاز!

ویڈیو میگزین
آنکھ مچولی

آج ہی طلب فرمائیے

قیمت: 150 روپے

Aankh Macholi Video Magazine
1 - PIB Colony Karachi

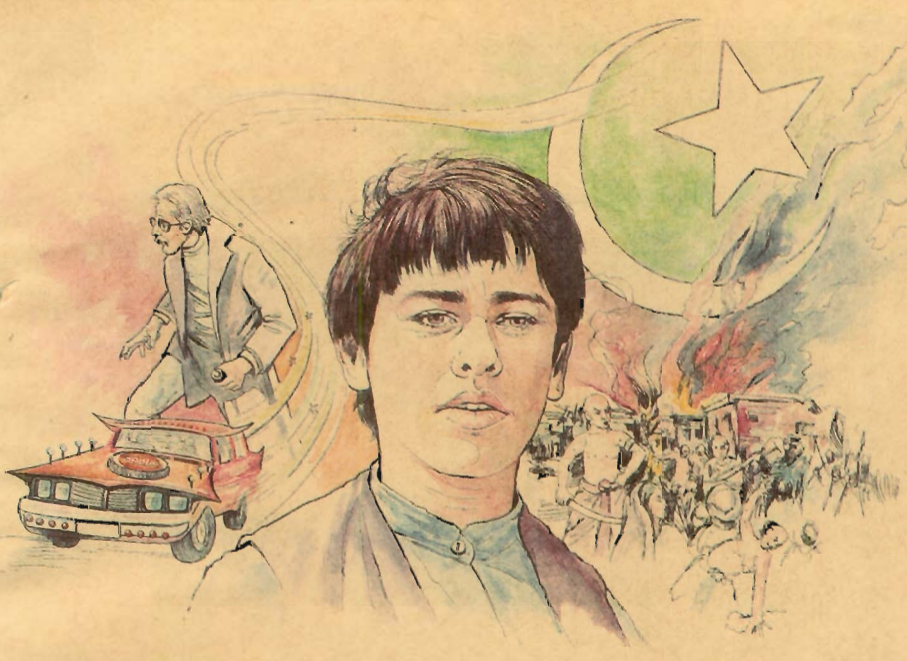

جب خواب بکھر جائیں

حسن فتح

پروفیسر انکل کی وہ عجیب و غریب گاڑی میرے سامنے تھی جس کا اگلا حفاظتی بمپر اتار کر انہوں نے اسے مزید نوک دار بنا دیا تھا۔

"یہ کیا انکل؟ آپ نے اپنی گاڑی کو خوبصورت بنانے کی کوشش میں بالکل ہی بدصورت بنا دیا ہے۔" میں نے کہا تو انکل بولے۔

"بے وقوف! یہ بدصورت گاڑی وقت کی رفتار سے زیادہ تیز چل سکتی ہے۔"

"کیا ــــ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" انکل کی بات سن کر میں حیرت سے چلا اٹھا۔

"کیوں بھئی! کیوں نہیں ہو سکتا..... چھوٹے!!" پروفیسر انکل مسکرا کر بولے۔

"آپ نے یہ انگریزی فلم "بیک ٹو دی فیوچر" سے متاثر ہو کر تو نہیں بنا ڈالی؟"

"شش!" پروفیسر انکل نے ایک دم مجھے خاموش ہونے کو کہا اور پھر آہستہ سے مسکراتے ہوئے بولے۔ "ہاں اسی انگریزی فلم سے متاثر ہو کر۔"

"کیا مطلب.....؟" میری زبان سے یک دم نکلا۔

انکل بولے۔ "دراصل میں نے یہ بات تو کافی پہلے ہی معلوم کر لی تھی کہ اگر کسی طرح ساؤنڈ بیریر کی طرح لائٹ بیریر توڑ لیا جائے تو انسان یا وہ مشین توانائی میں تبدیل ہو کر کسی اور زمانے میں پہنچ سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اتنی رفتار تک کیسے پہنچا جائے اور اس کا حل مجھے اسی انگریزی فلم سے ہی ملا تھا۔"

"نہیں ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ..... یعنی..... آپ کا مطلب ہے کہ ہم اب اس گاڑی میں سفر کر کے کسی اور زمانے میں بھی جا سکتے ہیں....." میرے لہجے میں بے چینی نمایاں تھی۔

"ایسا ہو سکتا ہے اور انشاء اللہ میں اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو جاؤں گا۔ لیکن اس بات کا ابھی کسی کو پتہ نہ چلے....."

انکل پروفیسر نے یہ کہتے ہوئے جلدی جلدی گیراج کا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ کر مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ڈرتے ڈرتے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

گاڑی کی اندر سے عجیب و غریب حالت تھی۔ ڈیش بورڈ میں سے درجنوں کی تعداد میں تاریں نکل کر پچھلی سیٹ پر جا رہی تھیں اور پچھلی سیٹ پر عجیب و غریب الیکٹرانکس کے آلات نصب تھے۔

"کیا واقعی، یہ گاڑی آپ کا مقصد پورا کرے گی؟" مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔

"بالکل .....!" یہ کہتے ہی پروفیسر انکل نے بسم اللہ، پڑھی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے گھر سے باہر نکال لی۔

"لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟" میں نے گھبراہٹ میں پوچھا۔

"ارے میاں، گھبراؤ نہیں ہم ماضی میں جائیں گے۔" پروفیسر انکل مسکرا کر بولے۔

"کیا.....؟"

جونہی گاڑی مین روڈ پر آئی تو انکل پروفیسر نے اللہ کا نام لیا اور گاڑی کی رفتار تیز کرنا شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی کی رفتار کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گاڑی ہوا میں اڑنے والی ہو اس کے علاوہ گاڑی کے اندر کا درجہ حرارت بھی بڑھ گیا تھا۔

جوں جوں گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی مجھے پکا یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اب گاڑی کسی کھمبے سے ہی ٹکرائے گی، یا پھر ایک دھماکے سے اڑ جائے گی۔ رہ رہ کر مجھے انکل کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن انکل پر تو جیسے ماضی میں جانے کا جنون سوار تھا۔ انہوں نے کار کی رفتار مزید بڑھا دی۔ شکل انہوں نے ایسی بنائی ہوئی تھی

جیسے ایف سولہ کے پائلٹ یہی ہوں۔

مارے خوف کے میں نے آنکھیں بند کر لیں پھر اچانک ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ اور اس دھماکہ کے ساتھ ہی میری زبان پر خود بخود کلمہ جاری ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لئے ہر طرف سفید روشنی پھیل گئی۔ پھر اگلے ہی لمحے میری آنکھوں کے سامنے ایک عجیب و غریب منظر تھا۔

وہ سڑک، بتیاں، عمارتیں، درخت سب کچھ غائب تھا۔ اور ہماری گاڑی ایک کچے راستے پر بھاگی جا رہی تھی جس کے ارد گرد کھیت ہی کھیت تھے۔ پروفیسر انکل نے ایک دم پوری طاقت سے گاڑی کی بریکیں لگا کر اسے روکا۔

گاڑی تو رک گئی لیکن اس کے اندر گرمی بڑھ گئی تھی میں ابھی گاڑی سے باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ انکل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "باہر نہ نکلنا۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک میٹر کی طرف اشارہ کیا جس کے شیشے سے گاڑی کے باہر کا درجہ حرارت پتہ چل رہا تھا۔

"کیا ہم ماضی میں ہیں؟" میں نے خوف سے انکل سے پوچھا

"ہاں! ..... کچھ ایسا ہی لگتا ہے.....۔"

پروفیسر انکل گھبرا کر بولے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے پر گھبراہٹ اور خوف نمایاں تھا۔

کچھ دیر بعد انکل نے پھر میٹر کی طرف دیکھا اور پھر مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کر کے خود باہر نکل گئے۔

انہیں دیکھ کر میں بھی باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ دوپہر کا وقت ہے۔ "لیکن اندر سے تو سب اندھیرا معلوم ہوتا تھا؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے گاڑی کی طرف دیکھا تو گاڑی کا شیشہ کافی حد تک سیاہ ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ گاڑی کا رنگ بھی جگہ جگہ سے اس طرح غائب تھا جیسے کئی گھنٹوں تک آگ میں جلتی رہی ہو۔

ہر طرف خاموشی تھی اور شدید گرمی۔

"یہ کون سا علاقہ ہے؟" میں نے پروفیسر انکل سے پوچھا۔

"وہی جہاں سے ہم چلے تھے۔" پروفیسر انکل نے جواب دیا۔

"لیکن وہ شہر، عمارتیں، سڑک .....؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب ابھی تک تعمیر ہی نہیں ہوئے۔" پروفیسر انکل نے جواب دیا۔

اب تو مجھے بھی کچھ کچھ یقین ہونے لگا تھا کہ ہم ماضی میں ہیں۔

"اب کیا کریں؟" میں نے پھر ایک سوال کیا۔

"پہلے تو گاڑی کے شیشے صاف کر کے اسے اس کھیت میں چھپا دیتے ہیں پھر کچھ اور سوچتے ہیں۔"

پروفیسر انکل نے یہ کہا اور گاڑی میں سے ایک کپڑا نکال کر میری طرف پھینک دیا۔

ابھی ہم نے شیشے صاف کر کے گاڑی کو کھیت

میں چھپایا ہی تھا کہ کچھ فاصلے پر ایک قافلہ جاتا دکھائی دیا۔ میں اور پروفیسر انکل فوراً ان کی طرف چل دیئے تاکہ لوگوں سے مل کر کچھ معلوم تو ہو کہ ہم کہاں ہیں؟ کس سن میں...اور تاریخ کیا ہے؟

ہم قافلے کے قریب پہنچے تو ایک بار پھر عجیب و غریب نظارہ دیکھنے کو ملا۔ قافلے میں تقریباً ہر عمر کا فرد شامل تھا لیکن ان سب کی حالت بے حد خراب تھی۔ قافلے میں تقریباً بیس پچیس افراد ہوں گے جن میں زیادہ تر تعداد عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی تھی۔ پورے قافلے میں صرف ایک بیل گاڑی شامل تھی جس پر کافی سارا سامان لدا تھا۔

ہمیں آتا دیکھ کر ایک نوجوان ہماری طرف بڑھا اور آتے ہی اس نے سوالیہ انداز میں ہم سے پوچھا۔ ”مسلمان ــــ؟“

میں نے پروفیسر انکل کی طرف دیکھا تو غالباً وہ بھی اسی سوچ میں گم تھے کہ اسے کیا جواب دیں۔ ابھی ہم خاموش ہی تھے کہ وہ شخص ہماری طرف آیا اور بولا ”لگتا ہے کہ آپ بھی ہندوؤں کے ظلم سے رات کے وقت بھاگے ہیں۔“ رات کے وقت بھاگنے کا مسئلہ میری سمجھ میں نہ آیا لیکن جلد ہی مجھے اس کا علم ہو گیا جب میں نے اپنے لباس کی طرف دیکھا۔ جلدی میں مجھے کپڑے بدلنے کا خیال ہی نہیں رہا تھا اور میں ابھی تک نیکر اور بنیان میں ہی تھا۔

”جی ہاں! کچھ ایسا ہی ہے۔ آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟“ انکل نے پوچھا۔

”جی میرا نام محمد علی اکبر ہے۔“ اس نوجوان نے بتایا۔ ”ہم بھی ہندوؤں کے ظلم و تشدد سے تنگ آکر پاکستان جا رہے ہیں۔ راستے میں دو بار ہندوؤں اور سکھوں نے ہم پر قاتلانہ حملے کئے۔ ہمارے بہت سے لوگ تو شہید ہو گئے۔ کسی طرح ہم لوگوں کی جان بچی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس شخص کی آنکھوں میں آنسو آگئے پھر آنسو پونچھتے ہوئے وہ بولا۔

”خدا کا شکر ہے کہ اب ہم لوگ پاکستان کی سرحدوں کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ لیکن خیر اب تو آپ بھی ہمارے ساتھ ہیں۔“

کچھ دیر بعد جب وہ شخص کسی کام سے آگے گیا تو میں نے انکل پروفیسر سے پوچھا کہ ”کیا واقعی ہم ۱۹۴۷ء کے دور میں آگئے ہیں؟“

”ہاں! اس وقت ہم سن ۱۹۴۷ء میں ہیں اور یہ سب لوگ پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔“

برسوں سے جو کتابوں میں پڑھتا آرہا تھا آج اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

قافلے میں شامل بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کی حالت مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ تقریباً ہر فرد کی بھوک سے بُری حالت تھی۔ قافلے میں شامل چند لوگ تو بالکل قریب المرگ لگتے تھے لیکن وہ صرف اس آس پر قافلے کا ساتھ دے رہے تھے کہ ایک بار پاکستان دیکھ لیں۔

ابھی ہمیں سفر کرتے کچھ دیر نہ ہوئی تھی کہ اچانک درختوں کے پیچھے سے کوئی دس بارہ سکھ نکلے اور انہوں نے قافلے پر ہلہ بول دیا۔ ان میں سے ہر کسی نے چاقو یا تلوار پکڑ رکھی تھی۔ انکل پروفیسر نے ایک دم مجھے ہاتھ سے کھینچا اور ایک کھیت میں چھپ گئے۔ ہر طرف چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ اور ہمارے سامنے مسلمانوں کی لاشوں کا ڈھیر لگنا شروع ہو گیا۔ بار بار دل کرتا کہ اٹھوں اور ان ظالموں میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑوں لیکن میں اور پروفیسر انکل بے بس تھے کچھ نہ کر سکے۔ حملہ آوروں کے جانے کے بعد ہر طرف اتنی خاموشی ہو گئی جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہیں ہو، لیکن حقیقت میں تو یہاں قیامت گزر چکی تھی۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں اور چاروں طرف خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔

پروفیسر انکل ایک عورت کی لاش کے پاس جا کر رک گئے۔ میں ان کے قریب گیا تو بولے، "جانتے ہو، ابھی اس حملے سے کچھ دیر پہلے علی اکبر مجھے بتا رہا تھا کہ یہ عورت صبح سے اپنے بچے کی لاش اٹھائے چل رہی تھی کہ اسے پاکستان پہنچ کر ہی دفنائے گی۔" یہ سنتے ہی میرے اوپر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور میں سوچنے لگا کہ ہمارے بزرگوں نے پاکستان کے لئے کس قدر قربانیاں دیں ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ کبھی اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتے شاید اس لئے کہ ہمیں پاکستان بیٹھے بٹھائے مل گیا ہم نے اگر قربانیاں دی ہوتیں تو یقیناً اس کی قدر معلوم ہوتی۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک جھاڑیوں میں سے ایک شخص باہر نکلا ہمارے قریب آ کر بولا:

میرا نام خالد ہے..... میں سکھوں کے حملے میں بچ گیا کیوں کہ آپ لوگوں کی طرح کھیت میں چھپ گیا تھا۔" پھر اس نے اور بہت ساری باتیں کیں تھوڑی دیر بعد کہنے لگا..... "آپ لوگ وہ نہیں جو نظر آ رہے ہیں..... آپ کون ہیں؟"

"ہم مسلمان ہیں اور آپ ہی کی طرح پاکستان جا رہے ہیں۔"

پروفیسر انکل بولے۔

"جھوٹ..... آپ لوگ مسلمان نہیں اور نہ ہی اس قافلے کے ساتھ آئے ہیں آپ تو ٹم ٹم نما مشین میں بیٹھ کر آئے ہیں۔"

"مشین ——؟" پروفیسر صاحب بولے۔

"ہاں میرے سامنے وہ مشین ایک زور دار دھماکے سے نمودار ہوئی تھی اور میں نے اسے دیکھ لیا تھا کیوں کہ میں قافلے سے آگے چل رہا تھا۔

پہلے تو پروفیسر انکل نے ٹال مٹول کی کوشش کی پھر سارا قصہ سنا دیا۔ اسے پہلے تو یقین ہی نہ آیا لیکن جب ہم نے اسے کھیتوں میں چھپی گاڑی اور اس کے آلات دکھائے تو اسے یقین آ گیا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کا نام خالد ہے۔ اور وہ ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم سے بچ کر اپنے بھائی اور بیوی کے ساتھ اس قافلے میں شامل ہوا تھا جو پاکستان

ہجرت کر رہا تھا۔ "افسوس! میرا بھائی اور میری بیوی میری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیئے گئے اور میں کچھ نہ کر سکا۔"

وہ شخص یہ کہتے ہوئے رونے لگا۔ میں نے اور انکل نے بڑی مشکلوں سے اسے چپ کرایا تو پوچھنے لگا

"آپ لوگ پاکستان سے آئے ہیں مجھے یہ بتایئے کہ پاکستان کا مستقبل کیسا ہے؟"

ابھی انکل کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ کے خیال میں پاکستان کا مستقل کیا ہونا چاہئے؟"

"میرے خیال میں ..... پاکستان کا مستقبل میرے خوابوں جیسا ہو گا۔

پاکستان ایک امن پسند اسلامی ملک ہو گا جہاں کوئی ظالم نہیں ہو گا۔ حکمران عوام کے محافظ ہوں گے۔ انصاف کا دور دورہ ہو گا۔

لوگ خوشحال ہوں گے، امن و آشتی ہوگی لوگ مل جل کر پیار و محبت سے رہتے ہوں گے۔"

وہ شخص اپنی دھن میں مگن جانے کیا کیا کہتا جا رہا تھا..... اور میں سوچ رہا تھا کہ اس بے چارے کو کس طرح بتاؤں کہ چند نا عاقبت اندیشوں نے پاکستان قائم ہونے کے چند سالوں بعد ہی اس کا مستقبل تاریک کرنا شروع کر دیا تھا انہوں نے انگریزوں کے مقولے "لڑاؤ اور حکومت کرو" پر عمل کرتے ہوئے بھائی کو بھائی سے لڑایا، نفرتوں کے بیج بوئے، انہوں نے انصاف کا خون کیا، ظلم کو ہوا دی، برائیوں کو پنپنے میں مدد دی، یہاں تک کہ کرسی کی لالچ میں آدھا ملک گنوا دیا اور..... اور اب بقیہ پاکستان بھی گنوانے کے چکر میں ہیں!!! ابھی میں اس قسم کی باتیں سوچ ہی رہا تھا اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جب خواب بکھر جائیں تو مستقبل تاریک ہی ہو جایا کرتے ہیں..... کہ اچانک وہ سکھ جنہوں نے قافلہ تباہ و برباد کیا تھا پھر شور مچاتے آن پہنچے۔ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے میرے سامنے کرپانوں سے انکل پروفیسر اور اس شخص کو مار ڈالا۔ اور اب وہ کرپانیں سنبھالے میری طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ میں کسی چیز سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا اور پھر میری آنکھ کھل گئی میں نے اپنے آپ کو بستر پر پایا۔

میں خواب دیکھ رہا تھا اس خواب کو دیکھے ہوئے مجھے کئی دن گزر چکے ہیں لیکن اس شخص کا سوال ابھی تک میرے ذہن میں گھوم رہا ہے کہ "پاکستان کا مستقبل کیا ہو گا؟"

شاید اس سوال کا جواب میں آپ یا کوئی اور ..... شاید کوئی بھی نہ دے سکے!!!

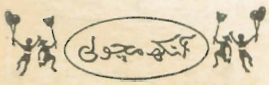

14 اگست

زاہد الحسن زاہد

آزاد ہم ہوئے تھے چودہ اگست کے دن
آباد ہم ہوئے تھے چودہ اگست کے دن
اس دن نے ہم کو بخشی، آزادیوں کی دولت
ہاں شاد ہم ہوئے تھے چودہ اگست کے دن

کشتی لگی کنارے، چودہ اگست کے دن
نازاں تجھے دل ہمارے چودہ اگست کے دن
تاریکیوں میں ابھرا سبز و سفید پرچم
روشن تھے چاند تارے چودہ اگست کے دن

ہم کو خوشی ملی تھی چودہ اگست کے دن
پھر زندگی ملی تھی، چودہ اگست کے دن
اس گلشنِ وطن کے ہر پھول، ہر کلی نے
پھر تازگی ملی تھی، چودہ اگست کے دن

بچے بھی جھومتے تھے، چودہ اگست کے دن
کلیوں کو چومتے تھے، چودہ اگست کے دن
غنچے مچل رہے تھے دل میں مسرتوں کے
زاہد بھی جھومتے تھے چودہ اگست کے دن

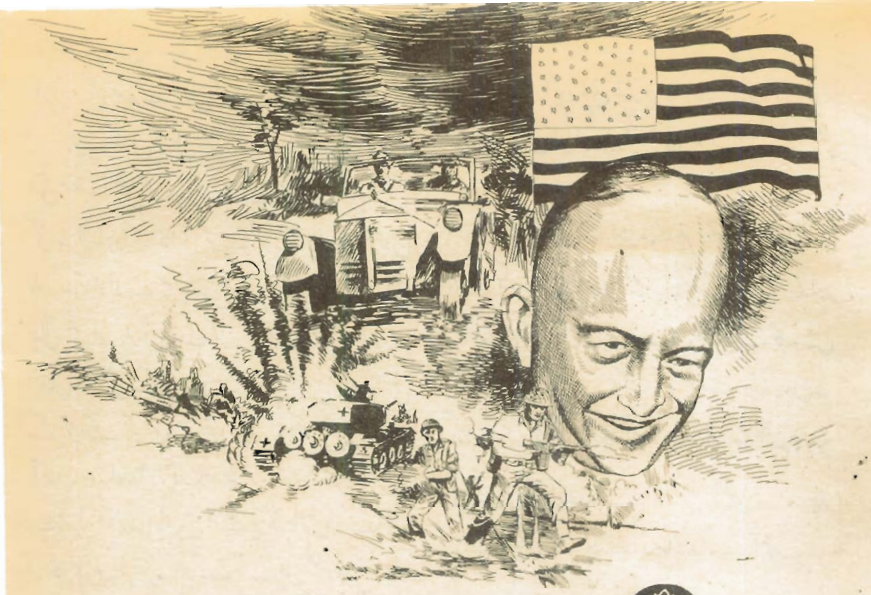

عزم و ہمت

حنان اکبر علی حنان

دوسری جنگ عظیم کے دوران جنرل آئزن ہاور کو ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر پہنچنا تھا۔ لیکن دشواری یہ حائل تھی کہ موسلا دھار بارش برس رہی تھی راستہ پہاڑی اور کچا تھا۔ رات اتنی اندھیری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود محاذ پر پہنچنا ضروری تھا، ورنہ اتحادی فوجوں کی شکست یقینی تھی۔ مصر کی طرف سے فیلڈ مارشل منٹگمری، تیونس کے محاذ پر جنرل آئزن ہاور اور آخری سرے پر جنرل ڈیگال کی کمان تھی۔ مقابلے میں اکیلا جنرل رومیل تھا۔ محاذ کی لمبائی اتحادیوں کے لئے خطرناک تھی۔ جنرل آئزن ہاور نے اپنے ڈرائیور کو حکم دیا کہ جیپ نکالو!

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کہا۔ "سر! میں تیار ہوں مگر راستہ بہت خطرناک اور کچا ہے، اوپر سے تیز بارش اور اندھیری رات۔" مگر آئزن ہاور نے حکم دیا۔ "میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور اب یہ فیصلہ ملتوی نہیں ہو سکتا۔ میرے ارادے کی تبدیلی ہماری فتح کو شکست میں بدل سکتی ہے۔ لہٰذا تاخیر کی اجازت نہیں۔" ڈرائیور نے جیپ اسٹارٹ کی اور موسلا دھار بارش اور اندھیری

رات میں جیپ کچے پہاڑی راستے پر دوڑنے لگی۔ ڈرائیور کی مہارت قابل تعریف اور مستند تھی۔

جیپ پھسل پھسل جاتی تھی مگر ڈرائیور کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ راستے سے ہٹ نہ سکتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ گاڑی گرتے گرتے بچی مگر آئزن ہاور کے ارادے میں تبدیلی نہ آئی۔ جیپ دوڑتی جاتی تھی اور بارش ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ اور پھر انتہائی کوشش کے باوجود جیپ اتنی تیزی سے پھسلی کے لڑھک کر ایک پتھر سے جا ٹکرائی۔ جنرل آئزن ہاور اور ڈرائیور باہر جا گرے۔ لیکن آفرین ہے جنرل آئزن ہاور کی ہمت پر کہ ڈرائیور سے مل کر گاڑی کو پھر سڑک پر لے آئے اور حکم دیا کہ چلو۔ یہ مرحلہ بہت نازک تھا۔ ڈرائیور نے انکار کر دیا۔

"میں آگے نہیں جا سکتا! خواہ کچھ بھی ہو۔"

جنرل آئزن ہاور چکرا کے رہ گئے۔ اتحادی فوجوں کا کمانڈر انچیف ڈرائیور سے انکار سن رہا تھا۔ جنرل نے کہا۔

"تم جانتے ہو ملٹری میں انکار کی سزا موت ہے؟"

ڈرائیور نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں سر! لیکن میں جان بوجھ کے موت کے منہ میں نہیں جا سکتا۔" جنرل نے کہا۔ "ذرا سوچو کہ تمہارے انکار کے نتیجے میں امریکی قوم غلام بھی بن سکتی ہے۔ میں جیپ خود بھی ڈرائیور کر سکتا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ فتح کی سعادت میں تمہیں بھی حصہ ملے۔"

لیکن ڈرائیور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر جنرل نے ریوالور نکال لیا اور ڈرائیور کی طرف تان کر حکم دیا۔

"بولو! اب کیا کہتے ہو؟ میں تمہیں ختم کر سکتا ہوں لیکن امریکا کو غلام نہیں بنا سکتا۔ مرنے کے بعد تمہارا نام غداروں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔ میں تمہیں صرف دس سیکنڈ کی مہلت دیتا ہوں۔ گیارہویں سیکنڈ پر گولی تمہارا سینہ چیر کے نکل جائے گی۔ ہاں تو ایک ـــــ دو ـــــ تین ـــــ چار ـــــ پانچ ـــــ چھ ـــــ سات ـــــ آٹھ ـــــ نو ـــــ اور ـــــ"

اس سے پہلے جنرل دس کا لفظ بولتے۔ ڈرائیور ان کے پاؤں میں جھک چکا تھا۔

"سر! مجھے معاف فرما دیجئے۔ میں بھی کتنا بے وقوف اور خود غرض ہو چکا ہوں۔ آپ بھی تو میرے ساتھ ہیں۔ آپ اتنے فرض شناس ہیں کہ موت کی پروا نہیں اور ایک میں ہوں کہ اپنی ناچیز جان کو بچانے کی فکر میں ہوں۔ اور پھر ایک بار پھر جیپ کچے پہاڑی راستے پر دوڑنے لگی۔ اور جب جنرل آئزن ہاور محاذ پر پہنچے تو یہ موقع اتنا نازک تھا کہ اگر وہ مزید پانچ منٹ لیٹ ہو جاتے تو جنگ کا پانسہ پلٹ گیا ہوتا۔ اس لئے کہ اس محاذ پر موجود فرانسیسی فوجوں نے لڑنے سے انکار کر دیا تھا اور جنرل کو یہ اطلاع مل گئی تھی انہوں نے موقع پر پہنچ

کر اپنے امریکی جوانوں کو حکم دیا کہ جو فرانسیسی فوجی ہتھیار نہیں اٹھاتا۔ اسے بلا دریغ گولی مار دی جائے۔ حملے کا حکم دیا گیا اور جوں ہی امریکی فوجوں نے فرانسیسی فوجوں پر فائرنگ کا ارادہ کیا انہوں نے ہتھیار اٹھا لئے اور امریکیوں کے شانہ بشانہ حملہ آور ہوئے۔ یہ حملہ اتنا شدید اور اچانک تھا کہ جرمنوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ دور تک پیچھے ہٹتے چلے گئے۔

یہ واقعہ جنرل آئزن ہاور نے اپنی خود نوشت داستان حیات "PRELUDE THE WAR" میں لکھا ہے۔

ایک ہے جیمی ایک ہے سوسن لیکن ہے یہ کس کی گردن

مقابلۂ چیخ وپکار میں ہم اوّل آئے

محمد بن مالک

ہم نے جس اسکول میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی وہ ایک سرکاری اسکول تھا، چنانچہ کالج میں داخل ہونے تک ہمیں کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ غیر نصابی سرگرمیاں کس بلا کو کہتے ہیں؟

جب ہم نے کالج باقاعدگی سے جانا شروع کر دیا تو آہستہ آہستہ ہم پر اس کے عیب و ہنر کھلتے چلے گئے۔ پتہ چلا کہ یہاں نصاب وغیرہ کچھ نہیں ہوتا، جو کچھ بھی ہوتا ہے، سب کا سب غیر نصابی ہوتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ جب کالج کی ساری ہی سرگرمیاں غیر نصابی ہیں، تو کیوں نہ ان سرگرمیوں کو اختیار کیا جائے۔ چناں چہ ہم نے انٹر کالیجیٹ تقریری مقابلے میں اپنا نام لکھا دیا۔

اس سے پہلے ہمیں کبھی کسی تقریری مقابلے میں حصہ لینے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ تقریری مقابلہ ایک دور دراز کے کالج میں منعقد ہو رہا تھا۔ مقابلے والے دن ہم نے صبح سویرے اٹھ کر

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کئی گھنٹے تک تقریر کی مشق کی۔ جب آئینے کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو ہم نے پریکٹس بند کر دی اور دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج رہے تھے اور مقابلہ گیارہ بجے شروع ہونا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی کپڑے بدلے، نئے جوتے پہنے۔ اچھی طرح تیار ہونے کے بعد گھڑی پر نظر ڈالی تو سوا دس ہو چکے تھے۔ بھاگم بھاگ بس اسٹاپ پہنچے۔ وہاں سے بس پکڑ کر کالج کی طرف روانہ ہوئے۔

جوں جوں ہم کالج کے قریب ہوتے جا رہے تھے، وہاں سے شور شرابے کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ جب ہم کالج میں داخل ہوئے تو یہ آوازیں چنگھاڑوں اور دھاڑوں میں تبدیل ہو گئیں، جس کی وجہ سے ہمیں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا پڑیں۔ کالج کے گراؤنڈ میں ایک بڑا سا شامیانہ لگا تھا۔ جس کے نیچے ایک طرف قطار در قطار لگی کرسیوں میں حاضرین محفل بیٹھے تھے۔ جبکہ دوسری طرف اسٹیج تھا، جس کے اوپر رکھی ہوئی عجیب وضع کی کرسیوں پر "معزز مہمانان گرامی" "صدر محفل" "منصفین" اور "وغیرہ وغیرہ" براجمان تھے۔ اسٹیج کے بائیں کونے میں ڈائس تھا جس کے پیچھے ایک صاحب کھڑے مائیک ہونٹوں سے لگائے حلق پھاڑنے میں مصروف تھے۔ گویا مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ شاید مائیک یا لاؤڈ اسپیکرز وغیرہ خراب ہیں، جبھی آواز اتنی خراب اور ہولناک نکل رہی ہے۔ مگر یہ ہماری "خوش فہمی" تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا، بس مقرر صاحب کا گلا خراب تھا جس کا خمیازہ سامعین کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ عبرت ناک بات یہ تھی کہ سب کے سب مطمئن بیٹھے تھے جیسے یہ سب معمول کے مطابق ہو۔ البتہ اسٹیج سیکرٹری ذرا گھبرایا ہوا تھا اسے اندیشہ تھا کہ مقرر صاحب کہیں مائیک ہی نہ چبا جائیں۔ ہم نے ان کی تقریر سننے کی بڑی کوشش کی اور جو کچھ سمجھ میں آیا، وہ کچھ اس طرح تھا:

"اگر کشمیری چائے کو ایک سو پندرہ درجہ سینٹی گریڈ پر جما کر اس میں تھوڑی سی گلقند ملا دی جائے تو چوں چوں کا مربہ بنتا ہے جو کہ جوتوں کے درد کے لئے سخت نقصان دہ ہوتا ہے اور اگر شیر خوار بچوں کو چورن لگی گنڈیریاں کھلائی جائیں تو ان کی دُم جلدی نکل آتی ہے اور

.....

اس سے آگے سمجھنے کی ہم میں ہمت نہیں تھی۔ ان کے بعد ایک طالبہ کو دعوت تقریر دی گئی۔ اس بی بی نے ڈائس پہ آتے ہی سامعین کو زبردست جھاڑ پلائی۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ ان کی تقریر کا انداز تھا۔

زبان کے ساتھ ساتھ موصوفہ کے ہاتھ بھی چل رہے تھے اور اس قدر تیزی سے چل رہے تھے کہ چار ہاتھوں کا گمان ہوتا تھا۔ ایک مزیدار واقعہ یہ ہوا کہ تقریر کرتے کرتے مقررہ صاحبہ ایک دم کچھ بھول گئیں، چنانچہ ان کی زبان تو رک گئی مگر ہاتھ

اسی طرح چلتے رہے، جس پر شرکائے محفل نے زور دار تالیاں بجائیں۔ اس حوصلہ افزائی پر انہیں اپنی بھولی ہوئی تقریر یاد آگئی چنانچہ انہوں نے پھر تقریر شروع کر دی۔ جب انہوں نے اسٹیج کو خیرباد کہا تو خوب تالیاں بجیں۔ جی ہاں..... تقریر ختم ہونے کی خوشی میں۔

اس کے بعد جن صاحب کو تقریر کے لئے بلایا گیا، وہ اچھے خاصے آل راؤنڈر معلوم ہوتے تھے۔ یعنی مقرر تو وہ تھے ہی۔ لیکن جب تقریر کے دوران وہ جوش میں آکر ہوا میں مکے لہرانے لگتے تو ان میں اور کسی باکسر میں بہت کم فرق رہ جاتا۔ ڈائس کے پیچھے وہ اس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے کرکٹ میں سلپ کے فیلڈر کھڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ڈائس کے دونوں جانب سے ان کے جوتے اور پتلون کے پائنچے نظر آرہے تھے۔ اس کے علاوہ تقریر کے بیچ میں وہ کبھی کبھار ایسے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دیتے کہ یقین ہو جاتا کہ مستقبل میں یہ سیاسی لیڈر بنیں گے۔ دوران تقریر مقرر موصوف نے جوش میں آکر مائیک کو ایسا زور دار لیفٹ ہک رسید کیا کہ وہ آگے پیچھے جھولنے لگا اس جرأت مندانہ اقدام پر حاضرین نے داد و تحسین کے شور سے سارا پنڈال سر پر اٹھا لیا۔ حاضرین کا رویہ حوصلہ افزا پا کر اب کے مقرر نے رائیٹ اور لیفٹ کا ایک زور دار کراس کامبی نیشن ڈائس کو رسید کیا۔ ڈائس کے ہلنے سے اسٹیج میں ارتعاش پیدا ہوا تو صدر محفل اور دیگر معززین جو

کامیابی مبارک

اپنی کامیابی سے

ہمیں بھی باخبر کیجئے

آپ کسی بھی کلاس
کے طالب علم ہوں ... اگر آپ نے کلاس میں
——— پہلی پوزیشن ———
——— دوسری پوزیشن ———
یا
——— تیسری پوزیشن ———
حاصل کی ہے تو اس کی تصدیق اپنے تعلیمی
ادارے کے سربراہ سے کروائیے اور ہمیں
بھجوا دیجئے؛
ہم آپ کو

پرائڈ آف پوزیشن

کی سند دیں گے

تحریکِ فروغِ علم میں پیش پیش

ماہنامہ

آنکھ مچولی

1- بی آئی بی کالونی، کراچی ۵

کہ اسٹیج پر رکھی کرسیوں پر خراٹے لے رہے تھے ایک دم چونک کر سیدھے ہو گئے۔ مگر کوئی تشویشناک بات نہ دیکھ کر دوبارہ "ریلیکس" ہو کر بیٹھ گئے۔

مقرر صاحب جب اپنی خطابت، باکسنگ، فیلڈنگ اور لیڈر شپ کے جوہر دکھا کر ڈائس سے نیچے تشریف لائے تو سب نے خوب خوب تالیاں بجائیں۔

اس کے بعد مقررین ایک ایک کر کے آتے رہے اور تقریریں کر کر کے جاتے رہے۔ سب کی تقریر کا وہی انداز تھا جو پچھلے مقررروں کا تھا، یعنی شور و غل اور چیخم دھاڑ سے بھرپور۔ جو مقرر جتنا زیادہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیختا، پبلک اسے اتنی ہی داد دیتی۔ غالباً تقریر پسند آنے کی شرط یہی تھی کہ کسی کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہ آنے پائے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک صاحب نے خلاف معمول بڑی صاف ستھری، رواں اور شستہ زبان میں تقریر کی تو پبلک نے انہیں اتنا ہوٹ کیا کہ انہیں تقریر ادھوری چھوڑ کر نیچے اتر آنا پڑا۔

سب سے آخر میں جب ہمارا نام پکارا گیا تو ڈائس تک جاتے ہوئے ہمارے گھٹنے کپکپا رہے تھے۔ آخر ہماری پہلی تقریر تھی۔ تمام نگاہیں ہم پر جمی ہوئی تھیں اور ہمیں اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ تقریروں کے نام پر چیخم دھاڑ نے ویسے ہی ساری تقریر بھلا دی تھی۔ لیکن ہم لوہے کو لوہے سے ہی کاٹنے کا مصمم ارادہ کر چکے تھے۔

رونے والا پرندہ

کتاب حیاۃ الحیوان کے مطابق سلطان محمد غزنوی کو کسی بادشاہ نے ایک ایسا پرندہ بھیجا تھا جس کی یہ خاصیت تھی کہ جس کھانے میں زہر ملا ہوا ہوتا وہ کھانا اگر دستر خوان پر آتا تو پرندے کی آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو جاتے اور آنسوؤں کا پانی نیچے گرتے ہی پتھر بن جاتا تھا۔

مرسلہ...... یاسر بن نثار، راولپنڈی

چنانچہ اپنی تقریر شروع کرتے ہی ہم نے ایسی فلک شگاف چیخیں ماریں کہ سب لوگ دم بخود رہ گئے۔ یہاں تک کہ اسٹیج پر براجمان معززین بھی "خوابِ غفلت" سے بیدار ہو گئے۔ پھر جب تک ہم "تقریر" کرتے رہے، پنڈال تالیوں سے گونجتا رہا۔ ہمارے تقریر ختم کرنے کے بعد بھی لوگ کافی دیر تک تالیاں بجاتے رہے۔ ان تالیاں بجانے والوں میں حیرت انگیز طور پر اسٹیج کے معززین اور مقابلے کے شرکا بھی شامل تھے۔ سب لوگ ہمیں "اتنی اچھی تقریر" کرنے پر مبارک باد دے رہے تھے۔

آخر میں جب منصفین کی جیوری نے مقابلے کے نتائج کا اعلان کیا تو سب نے متفقہ طور پر ہمیں اول انعام کا حقدار قرار دیا۔ شرکائے محفل نے زور دار تالیاں اور سیٹیاں بجا کر اس صحیح فیصلے پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا.............

ویسے یہ راز کی بات ہے کہ ہم نے تقریر کیا کی تھی......؟ کیونکہ اصل تقریر تو ہم پہلے ہی بھول چکے تھے____!!

سوال یہ ہے

ایاز محمود

سائنسی معلومات کا کالم

سوال:۔ کمپیوٹر وائرس سے کیا مراد ہے؟

سید سراج الدین شاہ جیلانی۔ لاڑکانہ

جواب:۔ کمپیوٹر وائرس (Computer virus) دراصل ایک پروگرام ہے، جو کمپیوٹر میں پہلے سے موجود پروگرام میں خرابیاں پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے کمپیوٹر استعمال کرنے والے کو درست نتائج حاصل نہیں ہو پاتے۔ وائرس اپنے آپ کو تیزی سے بڑھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ ایک سے دو اور دو سے چار ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں یہ ایک فائل سے دوسری فائل اور ایک پروگرام سے دوسرے پروگرام میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ وائرس مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ آج تک ان کی سینکڑوں قسمیں دریافت کر لی گئی ہیں۔ جب کوئی وائرس دریافت ہوتا ہے تو اس کا باقاعدہ نام رکھا جاتا ہے تاکہ ایک وائرس کو دوسرے سے ممتاز کیا جا سکے۔

اگر کسی وائرس زدہ پروگرام یا (Wata) کو ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر میں منتقل کیا جائے تو یہ بیماری وہاں بھی پہنچ جاتی ہے اور اس طرح ہوتے ہوتے جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ بعض اقسام کے وائرس کمپیوٹر کی کارکردگی کو بہت سست رفتار کر دیتے ہیں۔ بعض کمپیوٹر میں محفوظ شدہ اعداد و شمار کر تبدیل کر دیتے ہیں۔ کچھ وائرس ایسے ہیں جو کمپیوٹر کے اسکرین پر عجیب و غریب عبارات تحریر کرتے ہیں جس سے کام کرنے والا شخص خاصا پریشان بھی ہو سکتا ہے۔ وائرس کی کچھ

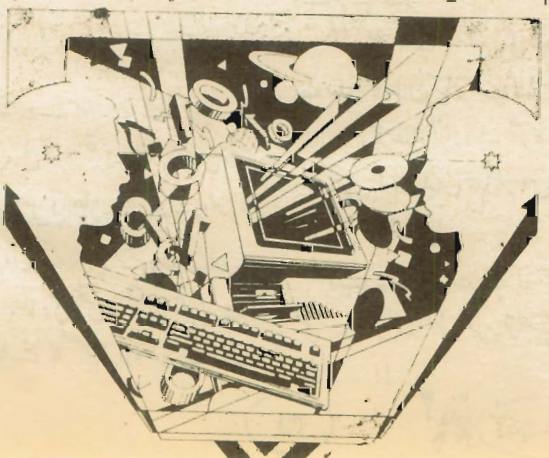

قسم ایسی بھی ہیں جو کمپیوٹر سسٹم کو جام کر کے رکھ دیتی ہیں اور کمپیوٹر کسی قسم کا کام کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔

اگر آپ کمپیوٹر استعمال کرتے ہیں تو آپ کو وائرس سے ہمیشہ ہوشیار رہنا پڑے گا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ اطمینان کئے بغیر دوسرے لوگوں کو اپنا کمپیوٹر استعمال نہ کرنے دیں۔ اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ تصدیق شدہ (Soft Ware) ہی استعمال کر رہے ہیں۔ اینٹی وائرس پروگراموں کی مدد بھی ضروری ہے۔ یہ پروگرام سسٹم میں موجود وائرس کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور اس کا خاتمہ بھی۔ ہمیں احساس ہے کہ آپ کا سوال ایک علیحدہ مضمون کا متقاضی ہے۔ اگر آپ مزید تفصیلات جاننا چاہتے ہوں تو الگ سے ہمیں خط لکھ بھیجئے، ہم اور وضاحت کر دیں گے۔

سوال..... لوگوں کی جلد کا رنگ الگ الگ کیوں ہوتا ہے؟ شاہدہ بانو، کراچی۔

جواب ..... جلد کے رنگ کی یوں تو کئی وجوہات ہو سکتی ہیں مگر بنیادی طور پر اس کی وجہ جلد کے خلیات میں رنگین ذرات کا پایا جانا ہے۔ ان ذرات میں سیاہ رنگ والے ذرات کو میلانن کہا جاتا ہے۔ جلد کے خلیات میں میلانن ذرات کی مقدار جتنی زیادہ ہوگی، جلد کا رنگ اتنا ہی سیاہی مائل ہوگا۔ یہ ایک موروثی سلسلہ ہے۔ یعنی جلد کا رنگ بچے کو ماں باپ سے عموماً وراثت میں ملتا ہے۔ مختلف خطوں کے باشندوں کی جلد کا رنگ بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ امریکا اور یورپی ممالک کے لوگ عموماً سرخ و سفید اور گورے چٹے ہوتے ہیں، چینی لوگ زردی مائل اور افریقی سیاہ رنگت کے ہوتے ہیں۔

جلد کے خلیات میں موجود میلانن بہت کام کی چیز ہے۔ یہ ہمیں سورج کی نقصان دہ کرنوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ خدا کی قدرت دیکھئے، جن ملکوں میں تیز دھوپ اور چلچلاتی ہوئی گرمی پڑتی ہے، وہاں کے لوگوں کا رنگ عموماً سیاہی مائل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفید رنگت کے لوگ دھوپ کے نقصانات کی زد میں رہتے ہیں اور انہیں جلد کے سرطان وغیرہ کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور برطانیہ کی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی میچ کے دوران اپنے چہروں پر کریم لگا لیتے ہیں جو دور سے واضح ہوتی ہے۔ یہ کریم ان کو سورج کی نقصان پہنچا دینے والی شعاعوں سے ایک حد تک محفوظ رکھتی ہے۔

سوال ..... پانی کا قطرہ گول کیوں ہوتا ہے؟

عبدالقدیر انڈھڑ، پنو عاقل۔

جواب ..... آپ نے دیکھا ہوگا کہ پانی کی سطح بالکل ایسی نہیں ہے کہ اس میں جس چیز کو ڈالیں تو وہ فوراً غڑاپ سے ڈوب جائے۔ بھاری بھرکم جہاز اور بے شمار چیزیں پانی میں تیرتی ہیں۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ اگر نہیں تو ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ پانی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی سطح پر ایک خاص تناؤ ہوتا ہے۔ اسے سطحی تناؤ کہا جاتا

ہے۔ اسی تناؤ کے باعث چیزیں پانی پر تیرتی ہیں اور ہمیں کپڑوں کا میل صاف کرنے کے لئے صابن یا دھلائی کا پاؤڈر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جو پانی کے سطحی تناؤ کو توڑ کر میل کے ذرات تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہی سطحی تناؤ ہے جس کی وجہ سے پانی کا قطرہ گولائی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

سطحی تناؤ پانی کے سالموں کی آپس میں کشش کی وجہ سے وجود میں آتا ہے۔ پانی کے سالمے ایک دوسرے کو آپس میں کھینچتے ہیں۔ سالموں کی کشش کی وجہ سے پانی کم سے کم جگہ گھیرتا ہے اور یوں گولائی کی شکل لئے قطرہ وجود میں آتا ہے۔

سوال..... ایڈز کیا ہے اور اس سے بچاؤ کے کیا طریقے ہیں؟

حاجی مظہر حسین لاشاری، بہاول نگر۔

جواب..... ایڈز ایک انتہائی موذی اور مہلک بیماری کا نام ہے جسے بجا طور پر خدا کا قہر کہا جا سکتا ہے۔ یہ بیماری جو ابھی تک ناقابل علاج ہے ایک خاص قسم کے وائرس سے پیدا ہوتی ہے جو ایک انسان سے دوسرے انسان میں منتقل ہو سکتا ہے اور یوں یہ مرض دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے۔ ایڈز کا وائرس انسانی جسم کے خود مدافعتی نظام کو تباہ کر دیتا ہے اور اس طرح جسم کسی بھی بیماری کے جراثیم کے خلاف اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں رہتا اور یوں آہستہ آہستہ ہلاکت کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔

ایڈز کا وائرس متاثرہ انسانی جسم کے خون اور دیگر رطوبتوں میں پایا جاتا ہے۔ اس سے بچاؤ کے لئے چند باتیں یاد رکھیں۔

۱۔ بے راہ روی کی زندگی سے ہر قیمت پر دور رہنا چاہئے۔

۲۔ ٹیکہ ہمیشہ غیر استعمال شدہ سرنج سے لگانے پر زور دیں۔

۳۔ خون کی منتقلی سے پہلے یہ اطمینان کرنا ضروری ہے کہ وہ ایڈز کے وائرس سے پاک ہو۔

۴۔ کسی کے استعمال شدہ بلیڈ یا ریزر وغیرہ کو استعمال کرنے سے بچنا چاہئے۔

آجکل ہمارے ملک میں ایڈز کا بہت چرچا ہے۔ یہ منحوس مرض امریکہ، یورپ اور بعض افریقی ممالک میں کافی پھیل چکا ہے۔ ہمارے ملک میں خدا کا شکر ہے کہ یہ عام نہیں۔ لیکن اس کے پھیلنے کا خطرہ اپنی جگہ موجود ہے جس کا مقابلہ اس کے بچاؤ کی ترکیبوں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

اطلاع

مئی ۱۹۹۴ء کے شمارے میں تحریری مباحثے بعنوان "پڑھائی کے لئے پٹائی ضروری ہے" کی دعوت دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں ادارے کو توقع سے زیادہ مضامین موصول ہوئے۔ تین بہترین مضامین کے فیصلے کا اعلان ستمبر ۱۹۹۴ء کے خاص نمبر میں کیا جائے گا۔ انعام یافتہ مضامین شائع بھی کیے جائیں گے۔ (ادارہ)

سائنس نیوز فرنٹ
Science Newsfront

خطرناک میزائل (طورس)

آپ آئے دن اخبارات میں پڑھتے ہونگے کہ امریکہ پاکستان کے ایٹم بم بنانے سے ناراض ہے۔ پاکستان کو چین سے ایم ۱۱ میزائل کی فراہمی میں روڑے اٹکا رہا ہے۔ لیکن خود امریکہ کیسے خطرناک میزائل بنا رہا ہے اسکا اندازہ اس میزائل سے کیا جاسکتا ہے جسکا نام طورس ہے۔ یہ ایک لاکھ پچاس پونڈ وزنی اور ۸۸ فٹ طویل ہے۔ اسمیں اپنے سے تین گنا زیادہ وزن کا اسلحہ لے جانے کی صلاحیت ہے۔ اسمیں چار راکٹ موٹر استعمال ہونگی اور اسے زمین سے فائر کیا جاسکے گا اسے کہتے ہیں دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت۔

آبی فون

یہ ٹیلی فون پانی کے اندر بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ واٹر پروف ہے اور اس میں تیزی سے بدلتے ہوئے درجۂ حرارت کو بھی برداشت کرنے کی صلاحیت موجود ہے خواہ درجۂ حرارت کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

الیکٹرک رکشہ

یہ وہ رکشہ نہیں جس پر لکھا ہوتا ہے
ڈرائیور کی زندگی بھی عجب کھیل ہے ■ موت سے بچو تو سنٹرل جیل ہے۔

اسمیں صرف ڈرائیور بیٹھ سکتا ہے۔ آپ اسے تین پہیوں والی ایسی موٹر سائیکل بھی سمجھ سکتے ہیں جو زیادہ محفوظ ہے۔ اس میں بیٹھنے کے بعد ہیلمیٹ پہننے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ کیلیفورنیا میں تیار کیا گیا ہے۔ الیکٹرک سے چلتا ہے اور ۶۰ میل تک جاسکتا ہے۔

THE FIRE OF FREEDOM
BROTHERS & SISTERS OF THE WALL, YOU
HAVE LIT THE FLAME
IGNITED WITH YOUR HOPES
AND DREAMS.
IT BURNS NOW
BRIGHTLY FOR ALL
THE WORLD TO BEHOLD
THE WALLS OF CONCRETE CRUMBLE AND FALL
JUST LIKE THE WALLS AROUND OUR HEARTS
FOR WHEN ALL OF OUR
WALLS DISAPPEAR,
THAT IS WHEN PEACE
WILL REIGN, AND
FIRE WILL BURN
EVER!
OTIS
LIBERTY

دیوارِ برلن

جو دیوار سے زیادہ ایک کتاب تھی

بن یامین

دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔

جرمنی، جاپان اور اٹلی ایک طرف تھے اور امریکہ، روس، برطانیہ اور فرانس وغیرہ دوسری طرف۔ پوری دنیا جنگ کی آگ میں جل رہی تھی۔ آخر کار جرمنی اور جاپان کو شکست فاش ہوئی۔ اتحادی ممالک جیت گئے۔ جاپان کو تو امریکہ نے ایٹم بم پھینک کر تباہ و برباد کر دیا البتہ جرمنی کے حصے بخرے کر دیئے گئے۔ ایک حصہ جو مشرقی جرمنی کہلاتا تھا، روس کے قبضے میں چلا گیا اور دوسرا حصہ یعنی مغربی جرمنی امریکہ کے پاس رہا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ایک ہی ملک کے باشندوں کو دو حصوں میں کیسے تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ انہیں آپس میں ملنے جلنے سے روکنا تو کسی طرح ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس مسئلے کا حل یہ ڈھونڈا گیا کہ دونوں حصوں کے درمیان ایک لمبی دیوار تعمیر کر دی گئی اور اس دیوار کو عبور کرنے پر پابندی لگا دی جائے۔ اس فیصلے کے تحت ۱۹۶۱ء میں برلن میں ایک دیوار بنائی گئی۔ یہ دیوار ایک سو پانچ میل لمبی تھی اور اس

کا ۴۵ میل تک کا حصہ کنکریٹ سے بنا ہوا تھا۔ لیکن دیوار بنانے والے یہ بھول گئے کہ اس طرح جسموں کو تو الگ کیا جا سکتا ہے لیکن دلوں کے درمیان کیسے فاصلہ پیدا کیا جا سکتا تھا۔ جب دیوار بن گئی تو جرمنی کے لوگوں نے اس دیوار کو اپنے خیالات اور جذبات کا آئینہ بنا دیا۔ وہ روزانہ اس پر کچھ نہ کچھ لکھ دیتے تھے۔ کبھی کوئی شعر، کبھی کوئی قول اور کبھی کوئی نعرہ۔ چنانچہ پچیس تیس برسوں کے اندر اندر دیوار برلن ایک کتاب بن چکی تھی جس پر جرمنی کے باشندوں نے احتجاجی تحریریں لکھ دی تھیں۔ سبق آموز بات یہ ہے کہ اس دوران کسی نے بھی دیوار پر کوئی گندی بات نہیں لکھی اور نہ کوئی تجارتی اشتہار لگایا۔

۱۹۸۹ کے اواخر میں جب افغان مجاہدین کی جدوجہدِ آزادی نے سوویت روس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تو دیوار برلن بھی گرا دی گئی۔ یکم جنوری ۱۹۹۰ء کو مشرقی اور مغربی جرمنی دوبارہ ملا کر ایک کر دیئے گئے۔ دیوارِ برلن گرنے پر کسی مبصر نے یہ خوبصورت تبصرہ کیا کہ دیوار برلن اپنے اوپر لکھی جانے والی تحریروں کا وزن نہ سہار سکی اور بالآخر گر گئی۔ یہ تحریریں جنہیں لکھنے والوں نے برش اور رنگوں کی مدد سے پینٹ کر کے نہایت خوبصورت بنا دیا تھا، طویل عرصے تک صحافیوں اور فوٹو گرافروں کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ٹیری ٹیل مین نام کے ایک فوٹو گرافر نے دیوار برلن کی ان تحریروں کی تصویریں اتاریں اور ایک کتاب مرتب کر دی۔ اس کتاب کا نام ہے "دی رائٹنگ آن دی وال۔" یہ کتاب بیک وقت پڑھنے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ٹیری ٹل مین کا کہنا ہے کہ میں نے اس دیوار کی تصویریں اور تحریریں اتارنے کے لئے پندرہ دن دیوار کے آس پاس گزارے۔ لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ میں نے کسی ایک شخص کو بھی دیوار پر کچھ لکھتے ہوئے نہیں پایا۔ نہیں معلوم لوگ اس دیوار پر کب کچھ لکھ جایا کرتے تھے۔ رنگین صفحے پر آپ جو تصویریں دیکھ رہے ہیں، وہ اسی فوٹو گرافر کی اتاری ہوئی ہیں۔ ان میں آپ ان بچوں کو بھی دیکھ سکتے ہیں جو دیوار کو گرانے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور وہ ہجوم بھی نظر آ رہا ہے جو اس دیوار کو عبور کرنا چاہتا ہے۔ اسی کتاب کی مدد سے ہم چند ایسے اقوال کا ترجمہ نیچے دے رہے ہیں جو اس دیوار پر لکھے گئے۔

— "دیواریں ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں ہوتیں"

(دیوار برلن پر لکھی ہوئی یہ تحریر واقعی سچ ثابت ہوئی)

— "صرف محبت سے ہی نفرت کو ذبح کیا جا سکتا ہے۔"

— "محبت کنکریٹ کی اس دیوار سے زیادہ مضبوط ہے۔"

— "دروازے بناؤ، دیواریں نہیں۔"

— "ساری دیواروں کو مسمار کر دو۔"

اور بھوک مر گئی

منیر احمد راشد

بھوک بہت ضدی تھی۔ ہر وقت کھانے کو مانگتی رہتی۔ اس کی ماں نے کئی بار سمجھایا کہ دیکھو ہر وقت کی ضد اچھی نہیں ہوتی مگر بھوک کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ اس پر تو ایک ہی دُھن سوار تھی ...... کھانا ...... کھانا ...... اور بس کھانا ـــ گھر میں جو کچھ میتسر تھا ماں اسے دے دیتی تھی ...... بلکہ اکثر اوقات دوسرے بہن بھائیوں کے حصے میں سے کچھ نہ کچھ اسے دے دیتی تاکہ اس کی نیت بھر جائے۔ مگر بھوک کی نیت کہاں بھرتی تھی۔ اس طرح تو اسے اور بھی ہوکا ہو گیا تھا۔

ملک ارم میں سب لوگوں کا کام اور کھانے کا حصہ مقرر تھا۔ بھوک کے باپ کے حصے میں جو کچھ آتا وہ اس کے گھر والوں کے لئے کافی تھا۔ مگر جب سے بھوک ...... پیٹو بنی تھی کھانا کم

پڑنے لگا تھا۔ اس کے ماں باپ پریشان تھے کہ اس کا کیا علاج کریں۔ مگر وہ علاج کرتے بھی کیسے، ملک ارم میں کوئی ڈاکٹر تو تھا نہیں۔ کیونکہ یہاں کبھی کوئی بیمار نہیں پڑتا تھا۔ سب لوگ محنت سے کام کرتے تھے۔ صبح سویرے اٹھتے اور رات کو جلد ہی سو جاتے تھے۔ باقاعدہ ورزش کرتے تھے۔ صاف اور تازہ غذا کھاتے تھے۔ سب مل جل کر رہتے اور اپنے اپنے حصے کا کام خلوص اور ایمان داری سے کرتے تھے۔ سب سے زیادہ کام ملکہ کرتی تھی۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ ذمہ دار تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ جب کسی ملک کے حکمران ایمان دار اور مخلص ہوں تو رعایا بھی اچھی ہو جاتی ہے۔

بھوک کے ماں باپ پریشان تھے کہ کیا کریں۔ کس طرح ننھی بھوک کا پیٹ بھریں۔ انہوں نے خوب سوچا خوب غور کیا اور تب یہ فیصلہ ہوا کہ بھوک خود جا کر ملکہ سے بات کرے۔ ہو سکتا ہے ملکہ ان کے گھرانے کی غذا میں کچھ اضافہ کر دے۔

بھوک گھر سے باہر نکلی۔ ملکہ کے محل کی طرف چلی۔ رستے میں پھولوں کے باغ، میووں کے درخت اور پکوانوں کی دکانیں نظر آئیں۔ بھوک کی رال ٹپکنے لگی۔ اُس دم لالچ نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی۔ شیطان نے ورغلایا پیٹ نے واویلا مچایا اور بھوک کی مت ماری گئی۔ وہ سیبوں کے ایک باغ میں داخل ہوئی۔ صحت مند بچے کے گالوں جیسے سرخ سیب دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ اب تو بھوک کو خود پر قابو نہیں رہا تھا۔ اس نے لپک کر ایک سیب توڑ لیا۔ بہت شیریں اور مزیدار سیب تھا۔ خوب مزے لے لے کر کھایا۔ پھر دوسرا کھایا، پھر تیسرا کھایا پھر چوتھا..... یہاں تک کہ اس کا پیٹ بھر گیا۔ مگر اس کی نیت نہیں بھری تھی۔ بھوک کی نیت کبھی نہیں بھرتی۔ پھر اس نے روز کا معمول بنا لیا اور کسی نہ کسی گھر سے یا باغ سے پھل اور چیزیں چرا کر کھانے لگی۔ یہ بات زیادہ دن تک چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ جلد ہی یہ بھید کھل گیا کہ ملک ارم میں کوئی چور گھس آیا ہے۔

ملکِ ارم میں ہزاروں سال کے بعد چوری ہوئی تھی۔ اس سے پہلے "ہوس" نے یہاں چوری کی تھی اور یہاں کے قانون کے مطابق اسے موت کی سزا دی گئی تھی۔ اس کے بعد کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ چوری کرے۔ اب جو مسلسل چوری کی وارداتیں ہوئیں تو پورے ملکِ ارم میں ہل چل مچ گئی۔ ہر طرف چور کی تلاش شروع ہوئی اور چند ہی دنوں میں بھوک کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا۔

قانون کے مطابق اسے سزا ملنی چاہئے تھی مگر ملکہ نے اس کی عمر دیکھتے ہوئے اس پر رحم کھایا اور صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ ملکہ کو کیا معلوم تھا کہ بھوک کو اگر آزاد چھوڑ دیا تو وہ ہوس کا روپ دھار لے گی۔ لہٰذا بھوک نے پھر چوری کی۔ اب کی بار سزا کے طور پر اسے سو سال کے لئے سنہرے پہاڑوں کے اندھے غاروں میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ بہت خطرناک علاقہ تھا۔ یہاں ہر

طرف درندوں اور سانپوں کا راج تھا۔ یہاں آنا موت کو دعوت دینا تھا۔ بھوک کو ایک اندھیرے غار میں دھکیل کر ایک بہت بڑے اور بھاری پتھر سے غار کا منہ بند کر دیا گیا۔

غار کے اندر اندھیرے میں بھوک بہت روئی، بہت چلائی۔ مگر اس کی فریاد سننے کے لئے وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ گھپ اندھیرے کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ انجانے خوف ہیولے بن بن کر اسے ڈرا رہے تھے۔ ہر لمحے کسی درندے یا سانپ کے کاٹ لینے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ماں باپ یاد آرہے تھے۔ ان کا پیار اور گھر کا سکون دل کو تڑپا رہا تھا۔ اس وقت بھوک اپنی بد نیتی پر بہت پچھتائی۔ مگر اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

بھوک بہت دیر تک غار کے پتھر سے لگ کر آنسو بہاتی رہی۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ اسے تو ہوش اس وقت آیا جب پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے اور پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ وہ کچھ دیر تک تو برداشت کرتی رہی..... مگر کب تک ..... یہاں بیٹھے بٹھائے تو اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا..... یہ تو اندھا غار تھا..... مگر وہ پھر بھی اٹھی۔ ٹٹول ٹٹول کر غار کی دیوار تک پہنچی۔ اور پھر اس کے سہارے آگے بڑھنے لگی۔ ہر قدم پر کسی سانپ، کیڑے کے کاٹ لینے کا خوف، کسی گہری کھائی میں جا گرنے کا اندیشہ..... کسی بد روح کے چمٹ جانے کا ڈر دامن گیر ہوتا۔ قدم رک جاتے مگر پیٹ شور مچا دیتا..... کھانا..... کھانا..... کھانا۔ مجبوراً بھوک کو آگے بڑھنا پڑتا۔ وہ چلتی رہی..... دیوار کے سہارے سہارے چلتی رہی..... جب تک ٹانگوں میں سکت رہی..... وہ چلتی گئی..... اس آسرے میں کہ کہیں نہ کہیں سے کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جائے گا..... مگر اندھیرے غار میں کھانے کے لئے خوف اور سر ٹکرانے کے لئے پتھروں کے سوا کچھ نہ تھا..... وہ تھک کر ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئی..... گھر ماں باپ بہن بھائیوں کو یاد کر کے رونے لگی۔ لالچ کو کوسنے لگی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ سانپ نکل چکا تھا اور لکیر پیٹنے کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ کچھ ہمت جمع کر کے بھوک ایک بار پھر اٹھی..... اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کی اور ایک طرف کو چل پڑی۔ اللہ میاں کو توبہ بہت پسند ہے۔ جب کوئی سچے دل سے توبہ کرے اور اللہ کے خوف سے اس کے آنسو نکل پڑیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آجاتی ہے۔ بھوک کی دعاؤں نے بھی اثر کیا..... اللہ کو اس پر رحم آگیا..... اسی وقت بھوک کا ہاتھ دیوار پر اُگی ہوئی گھاس نما کسی چیز پر پڑا..... اس نے جلدی سے وہ گھاس توڑی اور جلدی جلدی چبانے لگی۔ گھاس پیٹ بھرنے کے علاوہ کسی حد تک پیاس بھی بجھا دیتی ہے۔ یوں بھوک گھاس کھاتی..... سوتی جاگتی..... کئی سال تک غار کی بھول بھلیوں میں چلتی رہی۔

ایک دن اچانک اس نے غار میں پانی گرنے کی آواز سنی۔ برسوں بعد یہ آواز اس کی سماعت سے

ٹکرائی تھی۔ اس وقت اسے یہ آواز مسحور کن موسیقی سے بھی زیادہ بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بے تحاشا آواز کی سمت دوڑ پڑی..... مگر جلد ہی اسے اپنی حماقت کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایک موڑ مڑتے ہی وہ دھڑام سے ایک دیوار سے ٹکرائی اور فرش پر گر پڑی..... تب اسے معلوم ہوا کہ یہ آواز کسی خاص سمت سے نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ بند غار میں چاروں طرف سے یہ آواز آتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھی اور ایک جانب کو چل پڑی..... پانی کی تلاش میں..... جذبہ سچا ہو تو منزل ضرور ملتی ہے۔ بھوک بھی ایک دن اچانک چشمے کے سامنے پہنچ گئی..... سنہرے پہاڑ کے اندھیرے غار میں سفید دودھ جیسے پانی کا چشمہ دیکھ کر بھوک حیران رہ گئی۔ پانی کی چمک سے اردگرد کا ماحول نیم روشن سا ہو گیا۔ بھوک تو مدتوں کی پیاسی تھی..... جھٹ سے چشمے کے قریب ایک پتھر پر اتری اور ہاتھوں کی اوک بنا کر پانی پینے لگی۔ شہد کی طرح میٹھا پانی جب بھوک کے پیٹ میں پہنچا تو مزے سے اس کی روح بھی جھوم جھوم گئی اس نے جی بھر کر پانی پیا..... اور اتنا پیا کہ اس سے پتھر سے اٹھا تک نہ گیا..... وہ وہیں لیٹ گئی..... پانی میں عجیب نشہ تھا..... بھوک چند ہی لمحوں میں گہری نیند میں ڈوب گئی۔ یہ چشمہ آبِ حیات کا تھا..... اور بھوک اس سے واقف نہیں تھی۔ وہ دیر تک سوتی رہی۔ جب اٹھی تو آج کی دوسری خوشی اس کی منتظر تھی بھوک نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھا بہت اوپر اسے ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آیا۔ جہاں سے روشنی کی ایک کرن غار میں داخل ہو رہی تھی..... یہ روشنی کی کرن دراصل امید کی کرن تھی۔ بھوک خوشی سے ناچنے لگی۔ آج وہ اس غار کی قید سے آزاد جو ہو رہی تھی..... روشنی کے تعاقب میں چلتی ہوئی وہ اس سوراخ تک پہنچ گئی۔ یہ غار کا دوسرا دہانہ تھا۔ باہر نکل کر بھوک نے تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لئے۔ اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہ ہزاروں فٹ اونچے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی تھی۔ سورج کی روشنی میں چمکتے ہوئے سنہرے پہاڑ بالکل سونے کے لگ رہے تھے۔ نیچے..... بہت ہی نیچے ایک ٹیڑھی میڑھی سفید لکیر نظر آ رہی تھی۔ یہ دریا تھا جس کا شفاف پانی چاندنی کی طرح چمک رہا تھا۔ بھوک کو یہ منظر بہت بھلا لگا۔ وہ ذرا جھکی جیسے قریب سے اس منظر کو دیکھنا چاہتی ہو۔ اسی وقت تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ بھوک ڈگمگائی۔ سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود..... ہزاروں فٹ بلندی سے ہوا میں قلابازیاں کھاتی ہوئی ایک پتھر کی طرح وہ نیچے گرنے لگی۔ خوف سے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ ہوا کی سائیں سائیں سے کان بھی بند ہو گئے تھے۔ دل کی دھڑکن رک گئی تھی اور لمحوں میں منجمد ہو گیا تھا۔ بھوک کو یقین تھا کہ زمین سے ٹکراتے ہی اس کی روح پرواز کر جائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا..... وہ سیدھی پانی میں گری اور تیزی سے نشیب کی جانب بہنے لگی۔ پانی کی تیز لہروں پر بہتی، پتھروں سے ٹکراتی بھوک ملکِ رام کے پُر سکون

سمندر تک جا پہنچی ..... یہاں اسے ہوش آیا تو وہ اپنے زندہ بچ رہنے پر بہت حیران ہوئی۔ اور اسے ایک معجزہ سمجھتے ہوئے سمندر سے باہر نکل آئی۔ یہ جگہ اس کی دیکھی بھالی تھی۔ اسے یہاں سے گھر کا رستہ بھی معلوم تھا۔ وہ گھر کی جانب چلی۔ رستے میں سیبوں اور آموں کے باغات تھے۔ پھل دیکھ کر بھوک کی نیت پھر خراب ہو گئی۔ اپنی توبہ اور اللہ سے کیا ہوا عہد وہ بھول گئی اور باغ میں گھس کر سیب کھانے لگی۔ بد عہدوں کا انجام تو بُرا ہی ہوتا ہے۔ باغ کے مالی نے اسے دیکھ لیا اور پکڑ کر ملکہ کے حوالے کر دیا۔ اب کی بار اسے موت کی سزا دی گئی۔ پورے ملک ارم میں ڈھنڈورا پٹ گیا کہ بھوک اندھیرے غاروں سے فرار ہو کر دوبارہ بستی میں آگئی ہے..... اس نے پھر چوری کی ہے..... اور ملکہ نے اسے سزائے موت دی ہے۔ سزا والے دن سارے ملک کے لوگ ایک بڑے میدان میں جمع تھے۔ ملکہ نے خاص طور پر انہیں بلایا تھا تاکہ وہ چور کا انجام دیکھیں اور اس سے عبرت حاصل کریں۔ پھانسی کا پھندا تیار کر لیا گیا تھا۔ اور کچھ دیر کے بعد بھوک کو یہاں لایا جانا تھا۔ لیکن پھانسی دیئے جانے سے چند لمحے پہلے ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ بھوک نے پہرے داروں سے ہاتھ چھڑایا اور ایک طرف کو بھاگ لی۔ لوگ اس کی رفتار پر حیران تھے کیوں کہ اتنی تیز تو ملک ارم کے گھوڑے بھی نہیں دوڑتے تھے۔ بھوک دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ملکہ کے حکم پر پہرے دار اس کے تعاقب میں دوڑے ..... مگر بھوک ان کی پہنچ سے دور تھی۔ انہوں نے بھوک پر آگ کے گولے پھینکنے شروع کر دیئے ..... بھوک ان سے بچتی بچاتی، سیاروں اور خلاؤں سے ہوتی ہوئی زمین پر اتر آئی ..... آگ کے گولے برساتے پہرے دار بھی اس کے پیچھے تھے۔ بھوک بھاگتے بھاگتے تھک گئی تھی۔ تھکن سے اس کا بدن چور تھا..... لیکن وہ موت کے خوف سے بھاگ رہی تھی..... پہاڑوں، جنگلوں ..... میدانوں میں چھپتی پھرتی تھی ..... مگر کہیں بھی اسے پناہ نہیں مل رہی تھی..... پہرے دار اس پر مسلسل گولے برسا رہے تھے۔ بھوک کی حالت بُری تھی..... وہ چیخ چیخ کر رحم اور مدد کی اپیلیں کر رہی تھی۔

اور بھاگ رہی تھی ..... بھاگتے بھاگتے اچانک اس کی نظر ایک مخلوق پر پڑی۔ ملک ارم میں ایسی مخلوق اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی..... وہ فوراً اس کے پاس پہنچی اور بولی۔

"بھائی تم کون ہو؟"

"میں انسان ہوں ..... اور تم؟"

"میں بھوک ہوں۔"

"لیکن تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"وہ لوگ میرے تعاقب میں ہیں اور مجھے جان سے مار دینا چاہتے ہیں۔"

"وہ کون؟"

"پہرے دار ..... تم خدا کے لئے مجھے کہیں چھپالو..... ورنہ وہ مجھے جان سے مار دیں گے.....

دیکھو وہ آگ کے گولے برسا رہے ہیں۔ اگر اِس وقت تم مجھے ان سے بچالو تو میں تمہیں مالا مال کردوں گی...... میں بہت امیر ہوں۔"

انسان نے زمین پر گرتے شہاب ثاقبوں کو دیکھا خوفناک دھماکوں کو سنا۔ بھوک کی مظلوم صورت کو دیکھا اور بہت سے مال کا تصور کرکے خوش ہوگیا اس نے لالچ میں آکر بھوک کو اپنے پیٹ میں چھپالیا۔ یوں بھوک کو پہرے داروں سے نجات مل گئی۔

بھوک کو تو پہرے داروں سے نجات مل گئی مگر انسان آج تک بھوک کے ہاتھوں پریشان ہے اور اپنی لالچ کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔

وہ دن رات بھوک کا پیٹ بھرنے میں مگن ہے۔ جو لوگ بھوک کو نہیں کھلاتے بھوک خود انہی کو کھا جاتی ہے۔ بھوک کا بچپن کا مطالبہ آج بھی زندہ ہے۔ یعنی کھانا...... کھانا اور بس کھانا۔ انسان دن میں تین چار وقت پابندی سے بھوک کا پیٹ بھرتا ہے۔ اگر کھانا ملنے میں کچھ دیر ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ بھوک مرگئی...... لیکن بھوک کیسے مر سکتی ہے...... اس نے تو آب حیات پی رکھا ہے۔

اقوال زریں

- مظلوم کی بددعا سے بچو کیونکہ اس کی بددعا شعلے کی طرح آسمان پر جاتی ہے۔
- حرص، بخل اور ایمان کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔
- بڑا بدنصیب ہے وہ شخص جو بوڑھے ماں باپ کی خدمت کر کے جنت نہ حاصل کر سکا۔
- کھانے میں عیب نہ نکالو۔ ناپسند ہو تو نہ کھاؤ۔
- وہ آدمی خدا سے زیادہ قریب ہے جو سلام میں پہل کرتا ہے۔
- شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ والدین کی نافرمانی ہے
- جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی اس نے رحمت خداوندی کے دریا میں غوطہ لگایا۔

مرسلہ:۔ آصف سجاد۔ راولپنڈی

- ...... عمدہ چیز کا حاصل کرنا خوبی نہیں بلکہ اس کو عمدہ طریقے سے استعمال کرنا خوبی ہے۔
- ...... اتنے نرم نہ بنو کہ نچوڑ لئے جاؤ اور نہ اتنے خشک بنو کہ توڑ لئے جاؤ۔
- ...... ہر انسان ایک بند کتاب کی مانند ہے، جس کا سرورق کچھ اور ہوتا ہے۔
- ...... خوش خلقی ایک ایسا پھول ہے، جس کی خوشبو سے سب لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔
- ...... ہر ایک کو ایک خوشنما قبرستان تیار رکھنا چاہئے جہاں وہ اپنے دوستوں کی کوتاہیاں دفن کر سکے۔
- ...... جھوٹ بولنا سچ بات کہنے سے زیادہ مشکل ہے۔ سچ کو یاد رکھنے کی ضرورت نہیں کہ آپ نے کیا کہا تھا۔

مرسلہ:۔ جہانگیر احمد ملک۔ تلہ گنگ

محمد شاہد فیروز

کچھ امنگیں دلوں میں اجاگر کئے
پیارے پرچم کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے
گیت خوشیوں کے ہم آج گانے چلے
جشن آزادی ہم سب منانے چلے

اس کو محنت سے گلشن بنائیں گے ہم
مثلِ جنت وطن کو سجائیں گے ہم
آج ماضی کا وعدہ نبھانے چلے
جشن آزادی ہم سب منانے چلے

ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نئی شان سے
ظلم کو روند کر ہم نئی آن سے
دیکھو نفرت کی دیوار ڈھانے چلے
جشن آزادی ہم سب منانے چلے

مارنے سے مسلمان مرتا نہیں
اس لئے جان دینے سے ڈرتا نہیں
بات اتنی عدو کو بتانے چلے
جشن آزادی ہم سب منانے چلے

ہنستے ہنستے

ایک مزاحیہ اداکار نے ایک نجومی سے پوچھا۔
"کیا میں اگلے جنم میں گدھا بن سکتا ہوں۔"

نجومی نے جواب دیا۔

"ایک ہی روپ بار بار نہیں ملتا۔"

مرسلہ ...... احمد صدیقی، ملتان

ایک لڑکا حاضر جوابی میں بہت مشہور تھا۔ ہسپتال کی تعمیر کے لئے بنیاد کھودی جارہی تھی تو وہاں آکھڑا ہوا۔ قصبے کی میونسپل کمیٹی کا چیئرمین بھی معائنے کے لئے آیا ہوا تھا۔ لڑکے نے اس سے پوچھا۔ "یہ گڑھے کس لئے کھودے جارہے ہیں؟" چیئرمین لڑکے کو پہچان کر مسکرایا اور بولا۔ "ان گڑھوں میں قصبے کے سارے بدمعاش ڈال دیئے جائیں گے۔"

لڑکے نے جواب دیا "اگر سارے بدمعاش ڈال دیئے جائیں گے تو ان پر مٹی کون ڈالے گا؟"

مرسلہ ...... بشریٰ سید، حیدر آباد

بچہ:۔ ایڈیٹر صاحب آپ نے میری کہانی کیوں نہیں شائع کی؟

ایڈیٹر:۔ اس لئے کہ آپ کی کہانی ناقابل اشاعت ہے۔

بچہ:۔ "آپ اسے کیسے ناقابل اشاعت کہہ سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ پہلے بھی ایک رسالے میں چھپ چکی ہے۔"

مرسلہ:۔ عبدالباسط، ہری پور

تقسیم سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک پہاڑ پر تین آفیسر رہتے تھے جو انگریز تھے پہاڑ کی چوٹی پر بڑا افسر، پہاڑ کے درمیان، درمیانہ افسر، پہاڑ کے دامن میں چھوٹا افسر۔ ان تینوں افسروں کے کپڑے ایک ہی دھوبی دھوتا تھا۔ وہ گدھے پر کپڑے لاتا تھا۔ چونکہ اس کا گدھا چوٹی تک نہیں جا سکتا تھا۔ لہذا وہ درمیانے اور چھوٹے آفیسرز کو گدھے پر اور بڑے کو خود جاکر کپڑے دے آتا تھا۔ بڑے آفیسر نے جب یہ دیکھا تو اس نے اپنی توہین محسوس کی۔ چنانچہ جب دھوبی آیا تو افسر نے خوب غصے سے .... ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

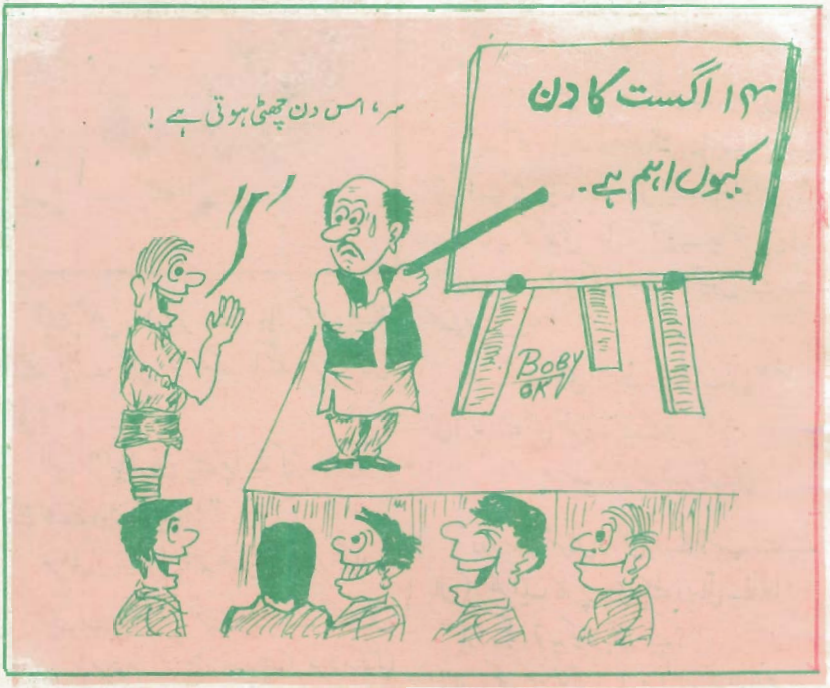

"یہ گدھا، وہ گدھا، ہم نہیں گدھا؟"

دھوبی نے فوراً ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ہاں صاحب آپ بھی گدھا!!"

مرسلہ..... محمد ظفراللہ ضیا، کمالیہ

ڈاکٹر (مریض سے): "میں مریض کی آنکھ دیکھ کر اس کا مرض بتا دیتا ہوں۔ اب یہی دیکھ لو! تمہاری اُلٹی آنکھ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ٹی بی ہے!!"

مریض: "جناب! مگر میری یہ آنکھ تو نقلی ہے۔"

مرسلہ..... راحیلہ نرگس، کراچی

باپ (بیٹے سے) "بیٹا! دیکھو، میں تمہیں شریر لڑکوں کی صحبت سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔"

بیٹا: "ابا جان! اسی لئے تو میں اسکول نہیں جاتا۔"

مرسلہ..... الماس زریں، کراچی

امی (منے سے) "بیٹا! ذرا پڑوس کے گھر سے گرم مصالحہ تو لے آنا۔"

منا "امی گرم مصالحہ کسی اور سے منگوا لیں میرے ہاتھ جل جائیں گے۔"

مرسلہ..... محمد عمر، کراچی

ایک شخص: (فقیر سے) بابا! تمہیں اتنے اچھے کپڑے پہن کر بھیک مانگتے شرم نہیں آتی؟"

فقیر: "کیا کروں پھٹے پرانے کپڑے دیکھ کر کتے کاٹنے دوڑتے ہیں!!"

مرسلہ..... فیصل احمد صدیقی، حیدر آباد۔

ایک صاحب کہیں تعزیت کے لئے گئے وہاں انہوں نے مرحوم کے بیٹے سے پوچھا کہ مرحوم کو کیا بیماری تھی؟

بیٹے نے جواب دیا "بیماری کیا تھی، بڑھاپا بذاتِ خود ایک بیماری ہے۔"

یہ سن کر ان صاحب نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں بھئی! یہ واقعی بہت خطرناک مرض ہے۔ ہمارے محلے میں بھی دو تین بچے اس بیماری سے مر چکے ہیں۔"

مرسلہ..... احمر صدیقی، ملتان

استاد: (شاگرد سے) پچاس میں سے کتنے نکالیں جائیں کہ باقی پانچ بچیں۔

شاگرد:۔ جناب صفر۔

مرسلہ..... شعیب، کراچی

ایک شخص پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ اس نے ایک ڈبے میں ایک موٹا آدمی بیٹھے دیکھا تو اس کے پیٹ میں گدگدی ہوئی۔ قریب جا کر پوچھا۔

"کیوں جناب! یہ کمرہ صرف ہاتھیوں کے لئے مخصوص ہے؟"

موٹے نے بڑی متانت سے جواب دیا "نہیں جی! گدھے بھی تشریف لا سکتے ہیں!!"

مرسلہ..... عدیل، کراچی

دو دیہاتی شہر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے ان کی نظر ایک کار پر پڑی پہلے دیہاتی نے کہا،

"یار! دیکھو تو یہ کیسا جانور ہے؟"

"اور دیکھو کیسے بھاگ رہا ہے!" دوسرا بولا پھر اس نے حیرت سے آگے ایک اسکوٹر کو دیکھا اور چلّایا۔

"ادھر دیکھو اس کا بچھڑا بھی دوڑا چلا آرہا ہے۔"

مرسلہ..... صائمہ شاد، کراچی۔

دو چھوٹے بچے بس میں سفر کر رہے تھے ایک کا رنگ بہت کالا تھا جب کہ دوسرے کا بہت گورا۔ کالے بچے نے گورے بچے سے پوچھا۔ "تم کون سی کریم استعمال کرتے ہو؟"

گورے بچے نے جواب دیا "فیئر اینڈ لولی"

اور تم کونسی کریم استعمال کرتے ہو؟
کالے بچے نے کچھ دیر سوچا پھر بڑی معصومیت سے کہا۔ "چیری بلاسم!"

مرسلہ ..... عبدالرافع، رحیم یار خان۔

ایک اَن پڑھ دیہاتی نے انگریزی کے دو حروف A اور B بولنا سیکھ لئے اور بہت خوش ہوا کہ اسے انگریزی آگئی۔

ایک دن اس کے گاؤں میں ایک پڑھا لکھا شخص آیا ہے تو دیہاتی نے بڑے رعب سے اس سے پوچھا "تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟" وہ شخص بولا "بی، اے تک۔"

دیہاتی قہقہہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا "انگریزی کے دو حرف پڑھے ہیں اور وہ بھی الٹے۔"

مرسلہ ..... نوید الرحمان، کراچی۔

ایک چھوٹا بچہ اپنے دوست کو اپنی خاندانی البم دکھا رہا تھا۔ ایک بوڑھے ضعیف آدمی کی تصویر دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ میرے دادا کی تصویر ہے جن کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔"

مرسلہ ..... شہنیلا شہاب الباری، کراچی۔

استاد: "تمہاری لکھائی دن بدن خراب کیوں ہو رہی ہے۔"
شاگرد: "جناب اس لئے کہ میرے ابو کی خواہش ہے کہ میں ڈاکٹر بنوں۔"

مرسلہ ..... بابر حسین، کراچی۔

"ہیلو! کیڑے مکوڑے بیچنے والی دکان؟"
"جی ہاں فرمایئے!"
"فوراً پانچ سو مختلف قسم کے کیڑے مکوڑے میرے گھر پہنچا دیجئے۔"
"لیکن آپ ان کا کیا کریں گے؟"
"جناب میں مکان چھوڑ رہا ہوں اور مالک مکان کی خاص ہدایت ہے کہ جس حالت میں مکان لیا تھا اسی حالت میں خالی کرو۔"

مرسلہ ..... مونا ملک، بہاولپور۔

فلم پروڈیوسر نے ڈائریکٹر کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری فلم میں وہ حصہ تو بہت ہی کامیاب رہا ہے، جہاں لوگ بے قابو ہو کر غل مچاتے ہیں۔" ڈائریکٹر نے کہا۔ "یہ سب آپ کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ یہ منظر ہم نے اس وقت فلمایا تھا۔ جب آپ نے ایکٹروں کی اجرتیں پچاس فیصد کم کرنے کا اعلان کیا تھا۔"

مرسلہ ..... شاہدہ ہاشم علی، بورے والا۔

ہم اخبار کیوں نہیں پڑھتے

ملیحہ افضل

ہم نہیں جانتے کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے یا بدقسمتی کہ ہمارا تعلق ایک عدد تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے، جس میں ایک سے ایک بڑا انٹلیکچول پایا جاتا ہے۔ لیکن ہم اپنا کیا کریں کہ اتنے زبردست خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود ہم میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے جو یہ ثابت کر سکے کہ ہمارا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔ ہمارے گھر کا ہر فرد کوشاں ہے کہ ہم میں بھی کوئی اپنے خاندان کی خوبی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلا قدم جو اٹھایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ ہم اخبار پڑھنا شروع کر دیں۔ لیکن کہاں اخبار اور کہاں ہم۔ بس یوں سمجھے کہ اینٹ کتے کا بیر والا معاملہ تھا۔ اخبار نہ پڑھنے پر ابو سے لے کر چھوٹے بھائی تک سب ہمیں یوں طعنے دیتے تھے کہ جیسے ہم دنیا میں پڑھنے ہی کے لئے بھیجے گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم مستقبل میں جرنلسٹ بننا چاہتے تھے۔

اخبار نہ پڑھنے کی ہماری اپنی الگ ہی منطق ہے

کیونکہ ہمارے خیال میں جو اخبار ترتیب دیتے ہیں وہ اخبار پڑھتے نہیں کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ کسی اخبار میں کوئی غلط خبر چھپ جائے تو ایڈیٹر کو فون آتا ہے کہ جناب آپ کے اخبار میں یہ خبر کیسے چھپ گئی جس پر ایڈیٹر حیران ہو کر کہتا ہے "یہ..... یہ خبر میرے اخبار میں چھپی ہے!؟" اسی لئے ہم جرنلزم پڑھنا چاہتے ہیں۔ جرنلسٹ بن کر کم از کم اخبار تو نہیں پڑھنا پڑے گا۔

ایک دن ہمارے چند دور پار کے رشتہ دار آئے اور غلطی سے ہم انہیں سلام کرنے چلے گئے۔ ہماری والدہ نے ان کے سامنے ہمارا کچا چٹھا کھول دیا۔ ہم شرمندہ ہوئے اور تہیہ کر لیا کہ آئندہ سے اخبار پڑھا کریں گے۔ اور پھر ہم نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ ہم ایک بات بتانا بھول گئے کہ ہم بچپن ہی سے بہت خوش مزاج اور خوش باش قسم کے واقع ہوئے ہیں لیکن جب سے اخبار پڑھنا شروع کیا ہم پر بیزاری بلکہ یوں کہئے کہ نحوست سی چھا گئی سارا دن بور گزرنے لگا۔ اور اگر اخبار نہ پڑھتے تو بالکل ٹھیک ٹھاک، تازہ دم رہتے۔ اب اخبار پڑھنا شروع کر دیا تھا تو چھوڑنا گوارہ نہ تھا کیونکہ ہماری نازک طبیعت مزید طعنے سننے کی روادار نہ تھی چنانچہ ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ امی سے کہتے کہ ہم اخبار لے کر اپنے کمرے میں ..... جا رہے ہیں، ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ کمرے میں جا کر خود بستر پر بیٹھتے اور اخبار کو دوسرے کونے میں پھینک دیتے۔ اس طرح گھر والے بھی خوش رہتے اور ہم بھی۔ لیکن ایک دن ہمارا بھانڈا پھوٹ گیا۔ ہوا یوں کہ ہمارے بھائی کو کسی طرح سے یہ راز معلوم ہو گیا۔ اور اس سدا کے چغل خور نے جا کر امی جان کو شکایت لگا دی۔ یہ انکشاف ہم پہ اگلے دن ہوا جب ہم حسب معمول اخبار لے کر اپنے کمرے میں جا رہے تھے کہ ہماری والدہ نے کہا "چندا آج میرے پاس بیٹھ کر اخبار پڑھو" ہم پریشان ہو گئے اور پہلا خیال یہی آیا کہ یہ کارستانی چھوٹے بھائی کی ہے والدہ ہمارے ساتھ کل کے کسی کالم پر بحث کرنے کو تیار تھیں۔ اب صورتحال یہ تھی کہ نہ تو ہم اخبار پڑھنے کو تیار تھے اور طعنے سننے کو چنانچہ ہم نے حالات کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کیا۔ ہم نے امی جان سے کہا "ٹھیک ہے ہم نے اخبار پڑھنا پھر چھوڑ دیا ہے۔ تاہم ہمارا ایک ہفتے کا تجربہ ہی کافی ہے اور ہم آپ کو اس وقت بتا سکتے ہیں کہ اخبار میں کیا خبر چھپی ہے۔ امی جان حیران ہوئیں جبکہ بھائی ہمیں ڈانٹ پڑنے کے اس نادر موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا فوراً بولا "ہاں بتاؤ چپ کیوں ہو گئی ہو"

ہم نے کہا "یہ بات ہے تو پھر لو سنو۔ اخبار میں کم از کم دس عدد قتل کی خبریں ہونگی۔ دو عدد خواتین گھر سے بھاگ گئی ہوں اور ان کے بھائیوں نے مارے غیرت کے انہیں ہلاک کر دیا ہو گا۔ ایک خبر شوہر کے ہاتھوں بیوی کے قتل کے بارے میں ہو گی۔ دو عدد خواتین چولہا پھٹنے سے ہلاک ہو گئی ہوں گی۔ کچھ خبروں میں زمین جائیداد کے جھگڑے ہونگے، اخبار کا پہلا صفحہ سیاسی بیانات سے بھرا

ہو گا۔ یہ بر سر اقتدار پارٹی نے کہا ہو گا کہ اپوزیشن ملک کو تباہ کرنا چاہ رہی ہے اور اپوزیشن کے لیڈروں کا بیان ہو گا کہ ہم اس حکومت کو چلنے نہیں دیں گے۔ اخبار کا اداریہ حکومت کی تعریف میں ہو گا اور ادارتی شذرے میں اپوزیشن کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہو گا۔ آخری صفحے پر اسکینڈلز ہونگے اداکاراؤں اور کھلاڑیوں وغیرہ کے بیانات ہونگے فسادات کی خبریں ہونگی اور اگر کوئی سیاسی بیان رہ گیا تو وہ ہو گا۔ ویسے ان کی تعداد میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے "ہاں ہاں بالکل یہی خبریں ہیں!" امی حیرت سے بولیں۔ "کیا تم نے آج کا اخبار پڑھ لیا ہے؟" باجی نے بے صبرے پن سے پوچھا۔ "آج کا" ہم نے قہقہہ مارا۔ "ہم تو پچھلے ہفتے سے یہی پڑھتے آرہے ہیں۔" اور یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے آئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ دوبارہ کسی نے ہمیں اخبار پڑھنے کو نہیں کہا۔

ایک ناپسندیدہ فیصلہ

کبھی کبھی کوئی فیصلہ نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتا ہے۔ آنکھ مچولی کو ایک ایسا ہی فیصلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ آنکھ مچولی نے ہمیشہ خود کو ایک معیاری، خوبصورت، دلچسپ اور معلوماتی رسالہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ رسالے کے ساتھ تحفہ دینے اور ہر سال موضوعاتی نمبر نکالنے کی روایت بھی آنکھ مچولی نے ڈالی۔ منافع کمانا اس رسالے کا کبھی مقصد نہیں رہا۔ اس کے برعکس یہ رسالہ اپنی اشاعت کے پہلے دن سے مسلسل خسارے کا شکار رہا ہے۔ اور موجودہ مہنگائی میں یہ خسارہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ ہمارے پاس تین راستے باقی رہ گئے ہیں۔

۱۔ رسالہ بند کر دیا جائے۔

۲۔ رسالے کے صفحات اور خاص طور پر رنگین صفحات کم کر دیئے جائیں

۳۔ قیمت میں کم از کم اتنا اضافہ کر دیا جائے کہ خسارے کا یہ بوجھ قابل برداشت ہو جائے۔

پہلی دونوں صورتیں یقیناً آپ کے لئے قابل قبول نہ ہوتیں اس لئے ہم نے تیسری صورت کو ترجیح دی ہے اور اس ماہ سے رسالے کی قیمت میں صرف دو روپے کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ گویا رسالہ اب دس روپے کے بجائے بارہ روپے میں دستیاب ہو گا۔ ہمیں امید ہے کہ اس ناپسندیدہ فیصلے کو آپ کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی جائیں گے۔ آنکھ مچولی سے محبت کا تقاضا تو یہی ہے!

(ادارہ)

شرارتی لکیریں

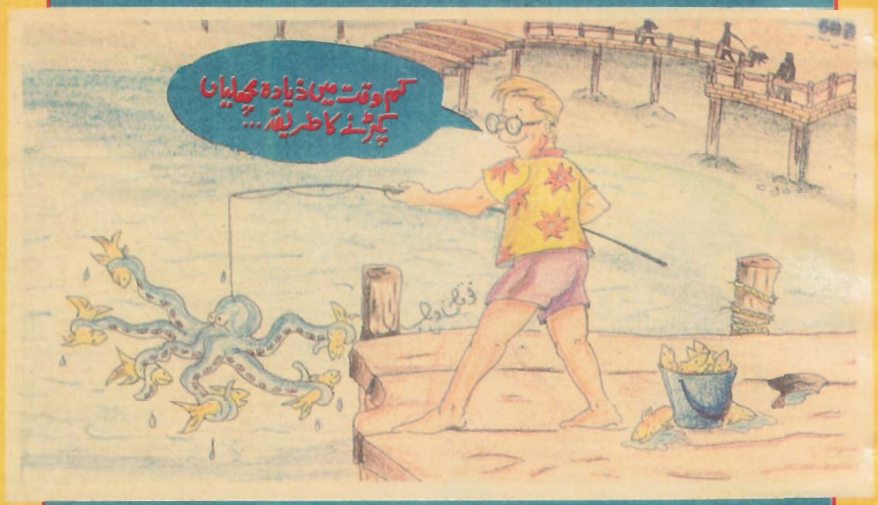

چسکا زبان کا خطرہ ہے جان کا

ہماری پہنچ وہاں تک ہے جہاں تک پرندوں کی پرواز ممکن ہے۔

گھونسلے اُتارنے کا اوزار "رادہ" اور اُترے ہوئے گھونسلے...

تیسری بار گھونسلے بچوں کے پر نکل آنے کے بعد اُتارے جاتے ہیں

سیاہ گھونسلے بنانے والی سوئفٹ لیٹ

اندھیرے غار کی سیر

تحریر : ایرک ویلی
ترجمہ و تصرف : ریحانہ منیر

زمین سے تین سو فٹ بلندی پر، بانس کی ایک نازک مچان پر کھڑے ہوئے میں نے غار میں نیچے جھانکا۔ گھپ اندھیرے کا ایک کنواں تھا جس میں ہزاروں ننھی چڑیوں کی بے چین چوں چوں کی گونج ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ ان ننھی چڑیوں کو سوئفٹ لیٹ کہا جاتا ہے۔

اس وقت میں تھائی لینڈ کے جنوب مغربی ساحل پر ایک جزیرے میں موجود تھا۔ میرے تین مقامی ساتھی، ساہت، ایم اور اپ، لچکیلے بانسوں اور باریک بیلوں کی مدد سے بندروں کی طرح چڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ ان کی عقب میں، اپنی مہم جُو طبیعت سے مجبور، میں بھی یہاں تک چلا آیا تھا۔ مگر کیسے آیا تھا؟ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میری بیوی ڈین سمرز مہارت سے اس ایڈونچر کی تصاویر اتارنے میں مصروف تھی۔ اور اب تو نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ البتہ غار کی تہہ میں نارچوں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں اِدھر سے اُدھر حرکت کرتی نظر آرہی تھیں۔

میں ابھی تک نیچے دیکھنے میں منہمک تھا کہ اِپ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "چلے آؤ!" وہ مجھے اپنے پیچھے آنے کا کہہ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ہمت کر کے پاؤں کی چوڑائی کے برابر بانس کے اس پُل پر قدم رکھا۔ بانس میرے وزن تلے چرچرایا۔ میں نے فوراً پاؤں واپس ہٹا لیا۔ مجھے ساہت کی وہ عجیب و غریب باتیں یاد آنے لگیں جو اس نے غار میں داخل ہونے سے قبل کی تھیں۔ اس نے کہا تھا۔

"تم نے ایک بڑا خطرناک کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ یہ غار بہت پراسرار ہیں۔ ان میں آج بھی روحوں کا بسیرا ہے۔ لیکن ہمارے بزرگوں کی محبت اور دیوتاؤں کی برکت سے ہم اُن سے محفوظ رہتے ہیں۔ رادا (گھونسلے توڑنے کا مخصوص اوزار) بڑی روحانی طاقت رکھتا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ہم ہر بلا سے محفوظ رہتے ہیں۔ البتہ اتنی احتیاط ضرور کرتے ہیں کہ غار کے اندر، گرنے، موت، خون یا خوف جیسے الفاظ ہم اپنی زبان سے ادا نہیں کرتے۔ اس سے روحیں ناراض ہو جاتی ہیں۔ اور پھر کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ ..... تم اناڑی ہو اور اجنبی بھی..... تم گر سکتے ہو..... لیکن خیر یہ ضروری بھی نہیں..... میرے والد تین مرتبہ گرے مگر پھر

بھی زندہ رہے...... دراصل ان کا وقت نہیں آیا تھا ...... ہاں تو تم چلو...... لیکن جن چیزوں کے بارے میں میں نے بتایا ہے...... ان سے پرہیز کرنا۔"

یہ ان لوگوں کے عقائد تھے۔ بڑے پختہ عقائد۔ ان عقائد سے قطع نظر میں نے اِپ کی زیادہ قرین قیاس بات کو اہمیت دی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ کسی بھی بانس پر قدم رکھنے سے پہلے، اسے ٹھوک بجا کر دیکھ لینا چاہئے۔ اگر وہ مضبوط نہیں ہے تو اس پر قدم بھی نہ رکھیں۔ اور بیلوں سے لٹکتے ہوئے کبھی بھی ایک یا دو بیلوں کا سہارا نہ لیں بلکہ کم از کم تین یا چار کا۔

خیر اب تو ہم منزل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جھاڑو نما مخصوص ٹارچوں کی روشنی میں سونفٹ لیٹ کے سیاہ رنگ کے اور سفید رنگ کے گھونسلے ہر طرف چٹانوں سے چپکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ تینوں نے بڑی پھرتی اور مہارت کے ساتھ راد اکی مدد سے یہ گھونسلے الگ کرنا شروع کئے۔ اِپ نے ایک گھونسلے کو، جو کہ ایک چینی کی پیالی سے مشابہ تھا، دو ٹکڑوں میں توڑا اور آدھا مجھے دیتے ہوئے اپنے حصے کے ٹکڑے پر دانت جما دیئے۔ میں نے بھی اس کی پیروی کی۔ ایک بے مزہ اور ربر نما چیز میرے منہ میں آئی۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ کیونکہ یہ گھونسلے پورے چین میں بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ خصوصاً ان کا سوپ بنا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہانگ کانگ کے ریستورانوں میں اس سوپ کے ایک کپ کی قیمت پچاس امریکی ڈالر بلکہ

اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ گھونسلے پچھلے پندرہ سو سال سے چین میں کھائے جا رہے ہیں۔ انہیں غذائیت بخش ہونے کے علاوہ دواؤں کی تیاری کے لئے بھی سود مند سمجھا جاتا ہے۔ ان غاروں کو باقاعدہ ٹھیکے پر دیا جاتا ہے جہاں سینکڑوں مزدور ٹھیکیدار کے لئے کام کرتے ہیں۔ غیر قانونی طور پر گھونسلے چُرانے والوں کو چھ ماہ تک کی سزا دی جاتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک گھونسلے کی مارکیٹ ویلیو سے زیادہ اس بات کی اہمیت تھی کہ فطرت کے ہنر مند پرندے کس طرح اپنے لعابِ دہن سے ان اندھیرے غاروں میں سینکڑوں فٹ بلندی پر یہ گھونسلے تعمیر کرتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ ان لوگوں کی مہارت اور ہمت قابلِ رشک تھی جو محض کمزور بانسوں اور باریک بیلوں کی مدد سے سینکڑوں فٹ اونچے یہ گھونسلے اتارتے ہیں۔ یہ کاروبار صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ تھائی لینڈ کے غاروں کا یہ تجربہ میری زندگی کے عظیم تجربات میں سے ایک ہے۔

سب سے بڑا کچھوا

ستمبر ۱۹۸۸ء میں ویلز کے ساحل پر آٹھ فٹ لمبا دس فٹ چوڑا اور ایک ٹن وزنی کچھوا مردہ حالت میں ملا جو سمندر کی لہروں کے ساتھ ساحل پر آیا تھا نیشنل میوزیم آف ویلز کے مطابق یہ اب تک دریافت ہونے والا سب سے بڑا کچھوا ہے۔

مرسلہ...... یاسر بن نثار، راولپنڈی

مزید محنت کی ضرورت ہے

ناقابل اشاعت تحریریں ضائع کر دی جاتی ہیں۔ ایسی تحریروں کی واپسی کا مطالبہ نہ کریں۔ تحریر بھیجتے وقت اس کی ایک نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں!! (ادارہ)

"الف سولہ" عماد مظہر (؟) "باز اور پانی کا کٹورا" آصف بن شرف، پنجگور "رمضان المبارک" رانا طارق جاوید، اوکاڑہ۔ "لالچ بری بلا ہے۔" کیڈٹ شیخ فرخ مصطفیٰ لاڑکانہ۔ "قربانی" محمد سلیم چکوال۔ "سنہرے حروف" اسماعیل سرسانہ، ملتان "انوکھا نجومی" محمد الحسن معاویہ، خوشاب۔ "کیا غریب انسان نہیں" جمشید احمد، لاہور۔ "پانچ ٹھگ" "محنت کا پھل" محمد شاہد اشرف، اوکاڑہ۔ "مغروری کا انجام" بابر علی بھٹی، کراچی۔ "نماز کے فوائد" صائمہ رشید، کراچی۔ "ماں کے قدموں تلے جنت" ارم نواز، رحیم یار خان۔ "کرنیں" نسیم نیاز، فیصل آباد۔ "انجام" وردہ جاوید، ملتان۔ "محبِ وطن" سعد علی خان، حیدر آباد۔ "میجر جنرل سکندر مرزا" آغا فیصل مرزا، کوئٹہ۔ "جو وہ چاہے" حبیب اللہ ماجد پرنس آف غریب آباد، پنجگور۔ "سورج ڈوبا نکلا چاند" (نظم) مریم فیاض، گجرات۔ "نیکی اور بدی" ذیشان آغا، پاک پتن۔ "جان کا نذرانہ" نجف علی۔ "شرارت سے توبہ" حنا مشتاق، لاہور کینٹ۔ "دو دانے" "اپریل فول" محمد حسنین گل، ڈیرہ اسماعیل خان۔ "بچوں کو تاکید" (نظم) عبدالطیف عصا، پسنی۔ "کمانڈر ان چیف" محمد افضل حمید، فیصل آباد۔ "انوکھا خواب" محمد عاصم، کراچی۔ "آزاد نوجواں" رباب فاطمہ، راولپنڈی۔ "اپریل فول" شازیہ ریاض (؟) "ہماری بجلی" افتخار حسین تاج، راہوجہ۔ "مجاہد" ثمرین فاطمہ (؟) "بلا عنوان" نعمان ایوب، آزاد کشمیر۔ "پیاری چڑیا" ثنا تنویر، کراچی۔ "نعرہ کشمیر" آسیہ خلیل، گجرات۔ "ایک دلچسپ واقعہ" فہد آفتاب، کراچی۔ "والدین کی نافرمانی" فہد حمدی، کراچی۔ "نظمیں" محمد یٰسین انجم، خانیوال۔ "کشمیری" صائمہ، کراچی۔ "ایک لڑکی" نوشی احمد (؟) "بطخ" محمد کاشف خان، دالبندین۔ "جلدی کا انجام" محمد انور خان بٹینی، کوٹ گلان۔ "حمد" قرۃ العین ساجدہ، شیخوپورہ۔ "گلاب" "بلی" "پاک وطن" عبدالقدیر انڈھڑ، پنو عاقل۔ "گرمی آئی ہے" سیدہ حنا نورین، کاظمی، کراچی۔ "یہ دروازہ مت کھولنا۔" سید خرم، کراچی۔ "بہادر ہو تو" ظہیر عباس خان، میانوالی۔ "نعمت" طارق رفیق بھٹی، اوکاڑہ۔ "قدرت کا فیصلہ" "انتظار" خرم طارق جنگو، گوجرانوالہ "تانگے والے" ثمینہ حبیب علی، لاہور۔ "شیشہ" نوشی احمد، گوجرانوالہ۔ "اچھے کام" میر عدیل پرویز، آزاد کشمیر، "نعت" محمد بلبل، سوات۔ "ریاض اور بیاض" نعیم شریف، کراچی۔ "نماز" زاہد حسین زاہد، پسنی۔ "محنت کا پھل" دھنی بخش اللہ (؟) "افسوس" محمد عاطف صدیقی، کراچی۔ "سکتہ" محمد عامر علی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ "عمران خان اور ورلڈ کپ" محمد عامر علی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ "تبدیلی" منظر عباس خان، جھنگ صدر۔ "بدلہ" شرجیل احمد وارثی، رحیم یار خان۔ "تھانے دار (نظم)" آفتاب احمد انصاری، گکھڑ منڈی۔ "مایوسی کفر ہے" شیر نواز گل،، ارمڑ پایان۔ "ہم نے بستر پر نہیں جانا" سمیعہ اکرم، اسلام آباد۔ "عدالت کا کمرہ" پھگن کمار کپور (؟) "میں اب نہیں ڈرتی" بشریٰ قیوم، بہاولپور۔

ادارہ

عکس ادھورے کیجیے پورے

اِس مقابلے میں ہم ہر ماہ کسی ایک شعبے سے تعلق رکھنے والی، دُنیا کی دو معروف شخصیات کے ادھورے خاکے شائع کرتے ہیں۔ آپ کو ان شخصیات کو پہچاننا ہے اور ان کی وجہ شہرت بتانا ہے۔ آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے آئندہ ماہ ہم صحیح جوابات کے ساتھ ان لوگوں کے مختصر حالاتِ زندگی بھی شائع کریں گے۔ بالکل صحیح جواب دینے والے ساتھی کو تین ماہ کے لیے ماہنامہ آنکھ مچولی مفت ارسال کیا جائے گا۔ ایک سے زیادہ درست حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جائے گا۔ مقابلے میں شرکت کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

- جوابات الگ کاغذ پر صاف صاف تحریر کیے جائیں۔
- ہر ماہ کی دس تاریخ تک ادارہ کو موصول ہو جائیں۔
- جوابات کے ساتھ بھیجنے والے کا مکمل پتا ضرور ہو۔

ان تین شرطوں میں سے کسی ایک بھی شرط کے پُورا نہ ہونے پر جوابات کو مقابلے سے خارج کر دیا جائے گا!

پتا: انچارج انعامی مقابلہ "عکس ادھورے کیجیے پُورے"
ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۔ بی آئی بی کالونی، کراچی ۷۵۸۰۰

نام _____

کلاس _____ اسکول _____

گذشتہ ماہ کے

درست جوابات:۔

ٹامس الوا ایڈیسن
وجہ شہرت۔ سائنس دان

ایڈیسن فروری ۱۸۴۷ء میں موضع میلان واقع اوہیو (امریکہ) میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین بہت غریب تھے۔ لیکن جوں توں کر کے انہوں نے اسے مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ جہاں اسے کند ذہن قرار دیا گیا۔ بارہ سال کی عمر میں وہ ریل میں کتابیں بیچتا بلکہ خود اپنا اخبار طبع کر کے فروخت کرتا۔ ایک دن ریل میں بنی ایڈیسن کی تجربہ گاہ میں اتفاقاً آگ لگنے سے ریل کے ڈبوں کا نقصان ہوا تو ایڈیسن کو وہاں سے نکال دیا گیا۔

ایڈیسن زندگی کی مشکلات کا سامنا کرتے کرتے بالآخر نیو جرسی میں اپنی تجربہ گاہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد تو جیسے ایجادات کی بارش ہونے لگی۔ اس کا اصول تھا کہ وہ چیزیں ایجاد کرنی چاہئیں جو لوگوں کے لئے ضروری اور کار آمد ثابت ہوں۔ فونوگراف، ٹیلیفون، بجلی کا قمقمہ، میگافون، سینما وغیرہ سب اسی کی ایجادیں ہیں۔

اسے لاتعداد اعزازات اور انعامات ملے۔ ۱۹۱۵ء میں اسے نوبل انعام ملا۔

۱۹۳۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان
وجہ شہرت۔ سائنس دان

پاکستان کے مایہ ناز سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان یکم اپریل ۱۹۳۶ء میں "دارالاقبال" بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر کے قریب پرائمری اسکول میں حاصل کی۔ سائنس شروع ہی سے ان کا پسندیدہ مضمون رہا۔ کراچی سے بی ایس سی امتیازی نمبروں میں پاس کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی چلے گئے۔ یہاں دو سال گزار کر ہالینڈ پہنچے اور میٹالرجی میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد بلجیئم میں ریسرچ فیلو شپ مل گئی اور یہیں سے ڈاکٹر آف انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ کچھ عرصہ ہالینڈ میں ملازمت کی۔ ۱۹۷۶ء میں وطن واپس آئے اور ملکی سالمیت اور ترقی کے لئے انہیں نہایت اہم ذمہ داری سونپی گئی جسے انہوں نے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور پھر دن رات کی محنت کے بعد ڈاکٹر قدیر نے ایٹمی ٹیکنالوجی میں پاکستان کو ممتاز کر دیا جو بلاشبہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔

وہ بہت سادہ مزاج انسان ہیں اور بڑی سادگی سے زندگی گزارتے ہیں۔ اتنا بڑا آدمی ہونے کے باوجود، غرور ان میں نام کو بھی نہیں ہے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے ساتھی

نعمت اللہ ساجن، تربت۔

بالکل درست جواب دینے والے ساتھی

سید عاطف عطا، کراچی ــ محمد شکیل، حیدر آباد ــ رضا عباس، کراچی ــ کمال فریدی، واہ کینٹ ــ محبوب ربانی، سرائے سدھو ــ فروہ بتول، کراچی ــ عائشہ رشید، لاہور ــ ظہیرالدین بابر، میرپور خاص ــ گل زرین مغل، ایبٹ آباد

سرحد کے اس پار کی غلطیاں

جولائی ۹۴ء کے شمارے میں ہم نے بچوں کے پسندیدہ مصنف اشتیاق احمد کی ایک کہانی شائع کی تھی۔ جس میں مصنف نے جان بوجھ کر چند غلطیاں چھوڑ دی تھیں۔ ہم نے اپنے قارئین کی ذہانت آزمانے کے لئے یہ غلطیاں تلاش کرنے کی ذمہ داری ان پر ڈالی۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ آنکھ مچولی پڑھنے والوں کی اکثریت نے وہ غلطیاں تلاش کر لیں۔ بلکہ کئی ساتھیوں نے تو ایسی غلطیاں بھی تلاش کر لیں جو مصنف نے کی ہی نہیں تھیں۔ مثلاً بعض ساتھیوں نے بتایا کہ "سرحد پر دشمن فوجی، نوجوان کو "بالٹ" کہتے ہیں۔ یہ ایک غلطی ہے۔ کیونکہ نوجوان مسلمان ہے اور کسی مسلمان کا نام "بالٹ" نہیں ہو سکتا۔"

بہرحال ہمارا یہ چھوٹا سا کوئز بہت کامیاب رہا اور ساتھیوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اب آتے ہیں ان غلطیوں کی طرف جو مصنف نے چھوڑی تھیں۔

- جاسوس کو فوراً قتل نہیں کیا جاتا بلکہ اسے زندہ گرفتار کرنے کی حتی المقدور کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس سے راز اگلوائے جا سکیں۔
- دشمن فوج کے میجر کو کیسے معلوم ہوا کہ سرحد پار کرنے والا جاسوس ہی تھا کوئی اسمگلر یا بے گناہ دیہاتی نہیں تھا۔
- ہندو اپنے مُردوں کی قبر نہیں بناتے تو وہ کسی مسلمان اور دشمن جاسوس کی قبر کیوں بنائیں گے۔
- میجر صدیقی چھ ماہ تک مسلسل قبر دیکھنے کیسے جاتے رہے۔ کیا ان کی ڈیوٹی تبدیل نہیں ہوتی تھی وغیرہ۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والی خوش نصیب — سیما عقیل الرحمٰن راجپوت، حیدر آباد۔

جن ساتھیوں کے خطبھی موصول ہوئے

کاشف جمیل، تربت۔ قمر سلطان، کراچی۔ نوشابہ اکرم، رحیم یار خان۔ نعمان محمود کاشمیری، گوجرانوالہ۔ مصحف رسول، کراچی۔ حناز سرور، بہاولپور۔ حماد الاحد، ماریہ رحمان، کراچی۔ شبنم عقیل راجپوت، حیدر آباد۔ الیاس اختر انصاری، حیدر آباد۔ سیدہ رابعہ احسن، حیدر آباد۔ زنیر احسن، میرپور خاص۔ شازیہ عندلیب اعوان، کراچی۔ جاوید اختر سومرو، رحیم یار خان۔ ارشد انیس، نواب شاہ۔ نائلہ دلاور خان، کراچی۔ سید عاطف عطا، کراچی۔ ماجد لطیف، لاہور۔ صائمہ دلدار بھٹی، جھمرہ سٹی۔ یوسف عطا، کراچی۔ عاقب عزیز خان، کراچی۔ عثمان جاوید، پشاور۔ تابندہ شفیق، کراچی۔ خرم طارق جکنو، گوجرانوالہ۔ مسعود احمد سومرو، گڈو۔ محمد شکیل راجپوت، حیدر آباد۔ سیدہ صائمہ ناز، کراچی۔ محمد عرفان عقیل راجپوت، حیدر آباد۔ محمد حسن بلوچ، کندھ کوٹ۔ محسن مختار، لاہور۔ سید منیر آفاق (؟)۔ شہر بانو بخاری رحیم یار خان۔ عمر مختار، بہاولپور۔ خرم نذر وڑائچ، لاہور۔ ملیحہ ثانیہ سحرش، واہ کینٹ۔ آغا ظفر احمد، کراچی۔ جویریہ شفیق، لاہور۔ سعدیہ بھٹی، واہ کینٹ۔ سید حنا نورین کاظمی، کراچی۔ مجاہد حسین، کراچی۔ شیخ علی رضا قصور۔ محمد اعظم اعزاز، ملتان۔ نوید شہزاد خان، کراچی۔ تابندہ ریاض، لاہور۔ صائمہ کوثر، لاہور۔ عماد سرور، بہاولپور۔ عائشہ رشید، لاہور۔ حسیب احمد صدیقی، کراچی۔ تنویر یونس، شیخوپورہ۔

ڈاکیہ آیا آنکھ مچولی لایا

اگر آپ گھر بیٹھے آنکھ مچولی پڑھنا چاہتے ہیں
تو پھر اس کے سالانہ خریدار بنیئے

سالانہ ممبر شپ کے فائدے

96 روپے کی بچت ہوگی
بک اسٹال کے چکر لگانے سے نجات مل جائے گی

آنکھ مچولی کے 12 عام شمارے
اور 2 خاص شماروں کی سالانہ قیمت 236 روپے
لیکن سالانہ خریداروں کے لیے صرف 140 روپے
سالانہ خریدار بننے کے لیے 140 روپے کا منی آرڈر کر دیجئے،
آنکھ مچولی آپ کو گھر بیٹھے ایک سال تک ملتا رہے گا۔

منی آرڈر کرنے کا طریقہ

اگر آپ "آنکھ مچولی" بذریعہ وی پی منگوانا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں ایک خط لکھ دیجئے۔ ہم آپ کو رسالہ بھیج دیں گے۔ یہ رسالہ آپ کے علاقے کا ڈاکیہ آپ تک پہنچائے گا۔ رسالے کے ساتھ ایک وی پی فارم ہوگا۔ اس فارم پر رسالے کا سالانہ چندہ یعنی 140 روپے لکھ کر رقم آپ ڈاکیے کے حوالے کر دیں گے۔ آپ کی ادا کی ہوئی رقم محکمہ ڈاک کے ذریعے دفتر آنکھ مچولی پہنچ جائے گی۔ جس کی رسید آپ کو بھیج دی جائے گی اور یوں ہر مہینے آپ کو پابندی سے رسالہ ملتا رہے گا۔ فرض کیجئے کہ آپ چاہتے ہیں کہ رسالہ راستے میں کبھی گم نہ ہو اور وقت پر آپ کو ملتا رہے تو پھر آپ کو رسالہ رجسٹرڈ ڈاک سے منگوانا چاہیئے اس کی رقم 200 روپے ہے۔

اسے کہتے ہیں: مناسب دام بہت آرام

لومڑی اور میاں کوّے

شان الحق حقی

ڈالے کے بیٹھا تھا ڈال پر کوّا
چونچ میں اک پنیر کا ٹکڑا

اس کو اک لومڑی نے جب دیکھا
اس کے منہ میں بھی پانی بھر آیا

دل میں بولی کہ ہائے یہ نعمت
ہاتھ آئے تو سیر ہو نیّت

آس میں تھی پنیر کی کب سے
لے اڑوں میں اسے کسی ڈھب سے

پیڑ کے نیچے آن کر بولی
ہائے کیا بات بھائی کوے کی

کیا لبھاتے ہیں چکنے چکنے پر
سر سے دم تک ہے کیا سجل پیکر

موہنی انکھڑیوں کے اندر ہے
چونچ بھی اس کی کیسی سندر ہے

کھینچتے جب ہیں کائیں کائیں کی تان
کھنچ کے آتی ہے تھوتھنی تک جان

رس گھلے کان میں اگر لیں تان
کھولتے ہی نہیں مگر یہ زبان

بھائی کوّے خموش مت بیٹھو
کچھ ہماری سنو کچھ اپنی کہو
کھول دو چونچ بس ذرا کی ذرا
گوشِ مشتاق منتظر ہے مرا
چکنی چپڑی جو اس نے کیں باتیں
آ گیا کوا ان کے بھترے میں
دل بہت اس کا باغ باغ ہوا
آسماں پر دماغِ زاغ ہوا
چاپلوسی کا چل گیا جادو
لومڑی نے بنا دیا الو
کائیں کرنے کو جونہی منہ کھولا
گر پڑا وہ پنیر کا ٹکڑا
لومڑی جھٹ اٹھا کے لے بھاگی
ڈوب مر کوے، بات تیری کی
یہ کہانی سنی تھی ہم نے یوں
جیسی دوہرائی آج جوں کی توں
پر یہ لگتی ہے بات بے پر کی
کوے پر جو کسی نے رکھ کر کی
بلکہ ہم کو ہنسی بھی آتی ہے
لومڑی کب پنیر کھاتی ہے
اور لے دے کے وہ بھی اتنا سا
جتنا کوے کی چونچ میں ہوتا
لومڑی کیسی اور کیا کوا
یہ بھی انساں کا ذکر تھا گویا
جانور تو نہیں ہیں ایسے فُول
جو خوشامد کو سُن کے جائیں پھُول
نام انسان کا جو ڈبوتے ہیں
بھائی وہ آدمی ہی ہوتے ہیں

قرض کی خاطر

اعجاز احمد

افریقہ کے ساحل کے نزدیک کھلے سمندر میں ایک چھوٹی سی کشتی بہتی جا رہی تھی۔ کشتی میں موجود افراد کا جہاز ایک حادثے کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کشتی میں مختلف علاقوں اور مختلف قوموں کے پانچ اشخاص موجود تھے۔ ایک شخص کیپٹن ٹیڈ تھا۔ وہ ڈوبنے والے جہاز کا کپتان تھا، دوسرا شخص عبداللہ تھا وہ جہاز کا ایک نوجوان افسر تھا اور عملے کا واحد مسلمان رکن تھا۔ تین دوسرے مسافر جہاز کے ملاح تھے۔ ان میں سے ایک کا نام ٹام، دوسرے کا بوبو اور تیسرے کا جانی تھا۔

عبداللہ جانتا تھا کہ کپتان کو کوئی معجزہ ہی زندہ رکھ سکتا تھا۔ جہاز میں جب آگ لگی تھی تو وہ جہاز کے عملے اور سامان کو بچاتے ہوئے بُری طرح جل گیا تھا۔ اور اب وہ چند لمحوں کا مہمان تھا۔ اس وقت سمندر پُرسکون تھا اور ہوا سمندر سے ساحل کی طرف چل رہی تھی اور کشتی آہستہ آہستہ ساحل

کی طرف بڑھ رہی تھی لیکن انہیں ابھی کتنا سفر اور طے کرنا تھا؟ ساحل ابھی کتنا دور تھا؟ وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

اس وقت زخمی کپتان کے ہونٹ ہلے عبداللہ نے کپتان کے منہ میں تھوڑا سا پانی ڈالا۔ کپتان تھوڑا سا مسکرایا اور پھر وہ آہستگی سے بولا "انجام قریب ہے۔ جب میں مر جاؤں گا تو اسی کشتی کے کپتان تم ہو گے۔ تم مشرق کی طرف بڑھتے جانا۔ تم افریقہ کی بندر گاہ فری پورٹ تک تقریباً چار دن میں پہنچ جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے جناب میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔" عبداللہ نے ادب سے جواب دیا۔

"دیکھو میرے بعد زندہ بچ نکلنے والوں میں تم ہی سب سے بڑے افسر ہو اور تم مسلمان بھی ہو۔ ایک مسلمان اپنے عہد کا پکا ہوتا ہے۔ اس لئے کپتانی کی ذمہ داری میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ کیا تم سمجھ رہے ہو؟" کپتان نے پوچھا۔

"جی جناب۔" عبداللہ نے جواب دیا۔

"میری پتلون کی پچھلی جیب میں ایک سیاہ رنگ کی ڈبیہ ہے۔ اسے حفاظت سے دیئے ہوئے پتہ پر پہنچانا۔ ہماری جہاز راں کمپنی نے اسے بحفاظت پہنچانے کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ اسے منزل مقصود تک پہنچانا میری اور میرے بعد تمہاری ذمہ داری ہے۔ اسے سپنک اینڈ کمپنی کے مسٹر سپنک تک پہنچانا ہے۔ ان کا دفتر فری پورٹ کے مرکزی علاقے میں ہے۔ یہ ڈبیہ ان کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کیا تم اسے بحفاظت اس کے مالک تک پہنچانے کی ذمہ داری قبول کرتے ہو؟" زخمی کپتان نے پوچھا۔

"میں اس ڈبیہ کو انشاء اللہ اس کے مالک تک پہنچاؤں گا۔" عبداللہ نے وعدہ کیا۔

"شاباش، مجھے تم سے یہی امید تھی۔ میری جیب سے ڈبیہ نکال لو۔"

عبداللہ نے زخمی کپتان کی جیب سے ڈبیہ نکال لی اور اس کے پاس بیٹھ کر اس کی تیمار داری کرنے لگا۔

"جہاز کے کاغذات بھی سنبھال لو اور میری بندوق بھی تھام لو، کشتی میں زیادہ پانی نہیں، پانی احتیاط سے استعمال کرنا۔ اگر کوئی شخص تمہاری اجازت کے بغیر پانی استعمال کرنے کی کوشش کرے تو اسے بندوق کی زد پر روکنا۔ تم بہت نرم دل ہو لیکن ایسے موقع پر نرمی نہ دکھانا۔ اگر تم انہیں ڈسپلن پر آمادہ نہ رکھ سکے تو تم میں سے کوئی بھی زندہ بچ کر ساحل پر نہ جا سکے گا۔" کپتان نے عبداللہ کو مزید ہدایات سے نوازا۔

"ٹھیک ہے جناب میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گا۔" عبداللہ نے جواب دیا۔

"بس میں نے تمہیں یہی کچھ کہنا تھا۔ خدا تمہارا مددگار ہو۔"

کچھ دیر بعد کپتان مر گیا۔ عبداللہ نے دوسرے ملاحوں کی مدد سے اس کے مردہ جسم کو سمندری لہروں میں بہا دیا اور خود کپتان کی ڈیوٹی سنبھال

لی۔

عبداللہ اپنے کپتان کی لاش بہانے کے بعد چپ چاپ اداس بیٹھا تھا۔ کپتان کی دی ہوئی ڈبیہ اس کے ہاتھ میں تھی کہ ٹام اس کے پاس پہنچا۔

"جناب اس ڈبیہ میں کیا ہے؟ کیا میں اسے ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟" ٹام نے کہا اور عبداللہ نے بے خیالی میں ڈبیہ اسے دے دی۔ ٹام نے ڈبیہ کھولی تو دوسرے دو ملاح بھی ڈبیہ دیکھنے لگے۔

"اوہ اس میں تو بہت قیمتی مال ہے۔ ہیرے، سونا، زیورات۔" ایک ملاح کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ملاح کے بولنے سے عبداللہ کا دھیان ڈبیہ کی طرف گیا۔ اس نے سوچا اسے ڈبیہ ٹام کو نہیں دکھانی چاہئے تھی۔

"ادھر لاؤ ڈبیہ۔" عبداللہ نے سخت لہجے میں کہا اور ملاحوں سے ڈبیہ واپس لے کر اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لی۔ "اس وقت پانی کا ایک گلاس ہر دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔" عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن کوئی ملاح اس کے مذاق سے لطف اندوز نہ ہوا۔ وہ تینوں کسی اور ہی خیال میں کھوئے ہوئے تھے۔

بوبو نے ٹام کے کان میں سرگوشی کی۔

"نہیں ابھی نہیں۔" ٹام نے عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

جب رات گہری ہو گئی تو وہ سب کشتی میں سونے کے لئے لیٹ گئے لیکن عبداللہ فکر مند تھا۔ اسے ڈبیہ کی دیکھ بھال کرنا تھی، پانی کے برتن پر نگاہ رکھنا تھی اور اپنی جان کی حفاظت بھی کرنا تھی۔ رات بھر وہ کبھی جاگتا اور کبھی سوتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر ٹام چوری چوری پانی کے مٹکے کی طرف بڑھا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔" عبداللہ نے دھمکی دی اور ٹام چپکے سے پیچھے ہٹ گیا۔

عبداللہ کے پاس دو دن کا پانی تھا اور چار دن کا سفر تھا اور اس کے ہمراہ ٹام جیسے لالچی ساتھی تھے۔ وہ دور افق پر نظریں گاڑے سوچتا رہا۔ اس سے پہلے وہ کسی نہ کسی کی ماتحتی میں کام کرتا رہا تھا۔ لیکن یہ اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ وہ ایک انتہائی خطرناک صورتِ حال میں کپتان کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ منزل کٹھن اور دور تھی اور اس کے عملے کے لوگ لالچی، خود غرض اور شاید اس کے خون کے پیاسے بھی تھے۔

اگلے دن ہوا چلنی بند ہو گئی تو کشتی رک گئی۔ اگر ہوا چلتی رہتی تو تین دن کا سفر باقی تھا۔ لیکن ہوا کے رک جانے سے زیادہ دن لگ سکتے تھے اور اگر خدانخواستہ ہوا کا رخ الٹ ہو گیا تو وہ دوبارہ سمندر کی طرف جانے لگیں گے۔ عبداللہ فکر مند ہو گیا۔ لالچی ملاحوں کی نظریں اس کی پتلون کی جیب میں رکھی ہوئی زیورات کی ڈبیہ پر مرکوز تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے پاس ایک دن کا پانی رہ گیا ہے۔ اور ابھی نہ جانے کتنے دنوں کا سفر باقی ہے۔

"مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ اپنا فرض ایمانداری سے سرانجام دینا چاہئے اور انجام خدا کے سپرد کر دینا چاہئے۔" عبداللہ نے سوچا اور یہ سوچتے ہی اس کے اندیشے ختم ہو گئے۔

ایک اور دن گزر گیا۔ تیسرے دن کی شام کو ٹام کہنے لگا۔

"فری پورٹ کا شمالی علاقہ بڑا محفوظ علاقہ ہے۔ وہاں نہ تو زیادہ آبادی ہے نہ پولیس گارڈ ہے۔ ہمیں اپنی کشتی وہاں لے جانی چاہئے۔ آپ کا کیا خیال ہے عبداللہ صاحب؟"

"مجھے کپتان کہو..... اور ہم سیدھے بندر گاہ کی طرف جا رہے ہیں اور کسی طرف نہیں۔" عبداللہ نے سختی سے جواب دیا

"دیکھئے جناب ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں سب کے فائدے کی بات کر رہا ہوں۔ ہم بندر گاہ سے ذرا دور کشتی ٹھہرا کر سارے زیورات آپس میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جہاز تباہ ہو چکا ہے، کس کو پتہ ہے کہ زیورات بھی جہاز کے ساتھ ڈوب نہیں گئے؟ زیورات تقسیم کرنے کے بعد ہم آبادی میں پہنچ جائیں گے۔" ٹام نے تجویز پیش کی۔

"ایسی باتیں مت کرو۔" عبداللہ نے حکم دیا۔

"ہمیں اس سے باتیں کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔" بوبو نے ٹام کو مشورہ دیا۔

عبداللہ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا لیکن جلد ہی اس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور ملاحوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بیوقوف مت بنو۔ یوں لگتا ہے تم پاگل ہو گئے۔ یہ زیور اصلی نہیں بلکہ نقلی ہیں یہ افریقی قبائلیوں کے ہاتھوں بیچنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ یہ زیورات کے نمونہ جات ہیں۔ افریقی قبائل ان زیورات کو اپنی عورتوں کو تحفتاً دیتے ہیں۔ وہ انہیں پہن کر اسی طرف خوشی محسوس کرتی ہیں جیسے متمدن علاقوں کی عورتیں اصلی زیورات پہن کر۔ اگر مسٹر سپنک کو یہ نمونہ جات پسند آئے تو وہ مزید زیورات منگوائیں گے۔"

لیکن ملاحوں کو عبداللہ کی بات پر یقین نہ آیا۔

جونی بولا "اگر زیورات نقلی ہیں تو کپتان انہیں سٹرانگ روم میں بند کر کے کیوں رکھتا تھا۔"

"دیکھو..... میں اس کشتی کا کپتان ہوں، مجھ سے اسے لہجے میں بات مت کرو۔" عبداللہ نے سختی سے کہا اور تینوں ملاحوں کے منہ لٹک گئے۔

چوتھے دن علی الصبح ملاحوں نے عبداللہ پر حملہ کر دیا۔ عبداللہ نے بندوق سنبھالی اور فائر کر دیا۔ ایک آدمی کی ٹانگ زخمی ہو گئی۔ وہ پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن اگلے ہی لمحے انہوں نے پھر حملہ کر دیا۔ ابھی کافی اندھیرا تھا۔ کوئی چیز صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔

"اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا"..... اسے ٹام کی آواز سنائی دی لیکن وہ پورا جملہ نہ سن سکا۔ کوئی چیز

زور سے عبداللہ کے سر پر لگی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

اسے جب دوبارہ ہوش آیا تو وہ کمر کے بل کشتی میں لیٹا ہوا تھا۔ کشتی پوری رفتار سے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے شدت کی پیاس لگ رہی تھی۔ ٹام نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اچھا تمہیں ہوش آگیا ہے۔ ہم ساحل تک پہنچنے ہی والے ہیں۔"

عبداللہ نے دیکھا کہ ٹام نے اس کی بندوق تھامی ہوئی ہے۔

"تم کیا کرنے والے ہو؟ کیا تم مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہو؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"اوہ نہیں۔ ہم تمہیں ساحل پر چھوڑ دیں گے اور خود اپنا راستہ لیں گے۔" ٹام نے جواب دیا۔

"لیکن یہ تو قتل ہو گا۔ ویران ساحل کے ساتھ ساتھ تو جنگل ہے۔ جنگل میں درندے ہیں۔ درندے مجھے چیر پھاڑ ڈالیں گے۔ میں جنگل سے باہر نہیں نکل سکوں گا۔" عبداللہ نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

ٹام نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

"ہم تمہیں زندہ رہنے کا ایک موقع دینا چاہتے ہیں...... شاید تم بچ جاؤ۔ جب تک تم راستہ ڈھونڈ کر آبادی تک پہنچو گے ہم فری پورٹ سے کہیں آگے جا چکے ہوں گے۔"

دوپہر کے وقت ان کی کشتی ساحل کے نزدیک پہنچ گئی۔ وہ سب ساحل کے ایک سنسان حصے پر اتر گئے۔ عبداللہ شدید زخمی تھا۔ اس کے سر پر گہری چوٹ لگی تھی۔ خون اس کے بالوں میں جما ہوا تھا۔ لیکن وہ لڑکھڑاتا ہوا، پر غمالی بنا ساحل تک پہنچ گیا۔ لیکن ساحل پر پہنچتے ہی اس کے ہمت جواب دے گئی اور وہ گر کر دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔

ٹام نے ایک مچھلی شکار کر لی تھی۔ ساحل پر ایک گھڑے سے انہیں صاف پانی بھی مل گیا تھا۔ وہ آگ جلا کر مچھلی بھون کر کھانے لگے۔ شام پڑ گئی تھی۔ پیٹ بھر کر وہ باتیں کرنے لگے۔

"اب ہمیں مال تقسیم کر لینا چاہئے۔" جونی نے تجویز پیش کی۔

"نہیں ابھی نہیں۔ بندر گاہ سے نکل کر ہم مال تقسیم کریں گے۔" ٹام نے کہا۔

"کیوں...... ابھی کیوں نہیں؟" بوبو نے جونی کا ساتھ دیا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" ٹام نے کہا اور جواہرات کی ڈبیہ اپنی پتلون کی جیب سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ وہ جواہرات کی تقسیم میں اس طرح منہمک ہو گئے کہ عبداللہ کو بالکل ہی بھول گئے۔

عبداللہ کو ہوش آیا تو اس نے لالچی ملاحوں کو دیکھا، ان کی باتوں کو سنا، دور جنگل کو دیکھا اس نے جنگل سے آتی وحشی درندوں کی آوازیں بھی سنیں اور اس نے آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے چولہے میں جلتی ہوئی ایک لکڑی اٹھالی اور ٹام پر حملہ کر دیا۔ ٹام اس حملہ کے لئے تیار

نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ سے بندوق گر گئی۔ عبداللہ نے لپک کر بندوق اٹھالی اور اس کا رخ لالچی ملاحوں کی طرف پھیر دیا۔

"ڈبیہ نیچے پھینک دو اور بھاگ جاؤ۔" عبداللہ نے سخت لہجے میں حکم دیا۔

ٹام نے ڈبیہ زمین پر پھینک دی اور وہ سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ عبداللہ نے اللہ کا نام لے کر جنگل کا رخ کیا اور باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ جنگل میں اندھیرا تھا۔ ہر طرف جھاڑیاں اور درخت تھے۔ جنگلی درندے تھے، زہریلے کیڑے تھے۔ خوراک اور پانی ندارد تھا۔ راستے اور سمت کا اندازہ نہیں تھا۔ لیکن عبداللہ جانتا تھا کہ وہ ایک ڈوبے ہوئے جہاز کا کپتان ہے..... اس کے پاس ایک امانت ہے..... اور اس کو وہ امانت اس کے مالکوں تک پہنچانا ہے۔ وہ گرتا پڑتا چلتا گیا، چلتا گیا۔

اس واقعہ کے کئی دن بعد فری پورٹ کے پولیس اسٹیشن میں انچارج آفیسر ایک سپاہی سے مخاطب تھا۔

"تم نے وہ پاگل آدمی کہاں سے پکڑا۔"

"جناب جنگل سے چند دیہاتی اسے پکڑ کر شہر لائے تھے۔ اس کے پاس ایک ڈبیہ تھی جسے وہ کسی قیمت پر اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔" سپاہی نے جواب دیا۔

"کیا اس نے بتایا کہ وہ جنگل میں کیسے پہنچا۔" آفیسر نے پوچھا

"جی جناب وہ ایک ملاح ہے۔ اس کا جہاز سمندر میں حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ کشتی کے ذریعے ساحل تک پہنچا ہے۔ اس کے ملاحوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ وہ اس سے ڈبیا چھیننا چاہتے تھے۔ وہ ان سے لڑ بھڑ کر جنگل میں پہنچا اور راستہ کھو بیٹھا۔ اگر وہ ایک آدھ دن مزید جنگل میں رہتا تو بھوک، پیاس اور موسم کی سختی کی وجہ سے اس کی موت یقینی تھی۔" سپاہی نے ادب سے جواب دیا۔

جس وقت سپاہی اور آفیسر کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی، عبداللہ فری پورٹ کے ایک ہسپتال میں داخل تھا۔ دو دن کے بعد جب اس کی طبیعت ٹھیک ہو گئی تو وہ پولیس آفیسر کے سامنے پیش ہوا۔ اس وقت جواہرات سے بھری ڈبیہ سامنے میز پر پڑی تھی۔ آفیسر کی درخواست پر عبداللہ نے ساری کہانی سنائی۔

"اچھا تو تم نے یہ ڈبیہ اس کے مالک تک پہنچانے کے لئے یہ سب تکالیف برداشت کیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان کی بازی بھی لگا دی۔" آفیسر نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اس لئے کہ میں نے یہ ڈبیہ پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اس لئے کہ یہ میرا فرض تھا۔" عبداللہ نے جواب دیا

"اوہ خدایا.....! کیا تمہیں علم نہیں تھا کہ یہ زیورات نقلی ہیں؟ ان کی قیمت معمولی ہے۔ اور تم چند ٹکوں کی مالیت کے زیورات کے لئے اپنی جان کی

بازی لگا بیٹھے۔ کیا یہ حماقت نہیں؟" آفیسر نے پوچھا۔

"جناب نہیں۔ یہ حماقت نہیں۔ میں جانتا تھا ...... میں بخوبی جانتا تھا کہ زیورات نقلی ہیں،" عبداللہ نے جواب دیا۔

"تو پھر تم کیوں اتنی تکلیف برداشت کرتے رہے؟"

"اس لئے ...... جناب اس لئے کہ یہ میرا فرض تھا۔ اس لئے کہ میں مسلمان ہوں۔ ایک مسلمان اپنے عہد کا پابند ہوتا ہے۔ وہ امانت اس کے مالک کے حوالے کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دیتا ہے۔ خواہ اس امانت کی مالیت معمولی ہی کیوں نہ ہو۔" عبداللہ نے وضاحت کی۔

"اوہ ......" پولیس آفیسر کے منہ سے فرط حیرت سے نکلا۔ وہ بے اختیار اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے عبداللہ کے کندھے پر تھپکی دی اور کہنے لگا۔

"شاباش جوان تم پر تمہاری قوم اور تمہارے ملک کے لوگ فخر کر سکتے ہیں۔"

عبداللہ نے پولیس آفیسر سے الوداعی مصافحہ کیا اور ڈبیہ اٹھا کر ڈبیہ کے مالکان کے حوالے کرنے کے لئے چل دیا۔

بچوں کے مشہور و معروف مُصنف
اشتیاق احمد
کے سنسنی خیز، ہنگامہ آرا، مزاح اور جاسوسی سے بھرپور ناول

۵۸۲۔ ابضال کی واپسی ۔۔۔ میڈیم خاص نمبر ۔۔ -/۶۰ روپے
۵۶۔ پراسرار مہم ۔۔۔ انسپکٹر جمشید سیریز ۔۔ -/۱۵ روپے
۵۷۔ خونی کیمپ ۔۔۔ " ۔۔ -/۱۵ روپے
۵۸۔ نیلا عذاب ۔۔۔ " ۔۔ -/۱۵ روپے
۵۹۔ دروازہ کھلا ہے ۔۔۔ " ۔۔ -/۱۵ روپے

۲۰ اگست ۱۹۹۴ء
کو آپ کے شہر میں ہر بڑے بکسٹال پر دستیاب
یا
پھر براہِ راست خط لکھ کر ادارے سے بذریعہ وی پی منگوائیں

اشتیاق پبلی کیشنز
۹/۱۲ نصیر آباد، مسلم پورہ، سانده کلاں لاہور، ۔۔ فون ۷۴۲۶۳۵۶

میرا رب دعا کا بڑا سننے والا ہے

اللہ سے رابطہ دعا کے ذریعے ممکن ہے یہ وہ پکار ہے جو اللہ تعالیٰ سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔

ادارے نے ایسی ہی مسنون دعاؤں کو خوبصورت اور دیدہ زیب اسٹیکرز میں چھاپا ہے۔ ایک مکمل سیٹ کا ہدیہ ۲۵ روپے رکھا گیا ہے

آنکھ مچولی کے پتے پر ۲۵ روپے کا منی آرڈر بھیج کر آپ یہ دعاؤں کا سیٹ منگوا سکتے ہیں

منگوانے کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی

چڑیا گھر کے جانور کیا کھاتے ہیں؟

اقبال جہاں فاروقی

A مگرمچھ

دال، گوشت، قورمہ، بریانی، سبزی، رائتہ، مرغ پلاؤ اور مچھلی یہ سب ذائقے دار کھانے ہم خود بھی کھاتے ہیں اور گھر یا ہوٹلوں میں دوسروں کو کھاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ لیکن بانس کی شاخیں، کیچوے، جھینگر اور چھپکلیاں ان سب کو بطور ڈش تیار کیا جا رہا ہو تو آپ ہی بتائیے کھانے والا کون ہے؟ مس کیتھی یاربرو اور مسٹر پیٹر ملر واشنگٹن کے چڑیا گھر کے چار ہزار مختلف جانوروں کے لئے روز آنہ ان کی من پسند ڈش تیار کرتے ہیں اور آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ اس چڑیا گھر کے جانوروں کے لئے کھانے کے سالانہ اخراجات ڈیڑھ کروڑ روپے ہیں مسٹر پیٹر اور مس کیتھی ہر ہفتہ مختلف ڈشوں کی تیاری کے لئے ۱۵۰۰ پونڈ غلہ ۱۰۰۰ پونڈ گوشت ۱۰۰۰ پونڈ مچھلی اور دیگر سمندری خوراک ۸۰۰ پونڈ فروٹ اور سبزیاں خریدتے ہیں ان کے علاوہ دو سو چوہے پچاس چوزے ساٹھ ہزار جھینگر اور ہزاروں کیچوے اور دیگر کیڑے مکوڑے خریدتے ہیں۔

دونوں باورچیوں کے کام کا مشکل ترین حصہ وہ ہے جب وہ ہر جانور کو اس کی پسندیدہ ایسی خوراک تیار کر کے دیتے ہیں کہ وہ انہیں کھا کر صحت مند بھی رہے۔

اب آپ کے لئے ایک کوئز ہے سامنے تصویر میں مختلف اشیاء اور جانوروں کی تصاویر ہیں بتائیے کونسا جانور کونسی خوراک زیادہ شوق سے کھاتا ہے۔

(جواب صفحہ نمبر .... پر دیکھئے)

1

2

3

4

5

6

7

8

B سمندری شیر

C گوریلا

D شیر

E ٹنریک

F ہرا سانپ

G سرخ پانڈا

چار اور ایک

آفتاب احمد

ادھیڑ عمر رحمت علی کے چاروں بیٹے اس کے سامنے سوال بنے بیٹھے تھے۔ چاروں اب بچپن کی دہلیز پار کر چکے تھے۔ ان کی والدہ بہت عرصہ پہلے فوت ہو گئی تھی۔ رحمت علی نے نہ صرف باپ بن کر بلکہ ماں بن کر بھی انہیں پالا تھا۔ اس کے بیٹے اکثر اوقات اس سے ایک سوال کرتے تھے لیکن رحمت علی ہر مرتبہ بات گول کر جاتا تھا۔ آج چاروں نے پروگرام بنا کر اپنے باپ کو گھیر لیا۔

”ابا جان! آج آپ کو بتانا ہی ہو گا۔“ سب سے بڑے بیٹے اکرم نے کہا۔

”اباجی! یہ آپ کا ہم پر احسان ہے کہ اس مہنگائی کے دور میں ایک مزدور ہوتے ہوئے بھی آپ نے ہمیں دینی اور دنیاوی تعلیم دلوائی۔ کھانے پینے، پہننے، غرض کہ ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھا یہاں تک کہ ہمارے شادی بیاہ کے اخراجات کا بھی بندوبست کر کے رکھ لیا ہے لیکن جب بھی ہم آپ سے یہ سوال کرتے ہیں تو آپ ٹال جاتے ہیں۔“ سب سے بڑے بیٹے سے چھوٹے بیٹے اسلم نے سوال کیا۔

”آپ ہماری تمام جائز ضروریات پوری کرتے ہیں، معقول جیب خرچ بھی دیتے ہیں، لیکن جو رقم آپ بچا بچا کر جوڑ جوڑ کر رکھ رہے ہیں اور ایک عرصہ دراز سے رکھتے چلے آرہے ہیں اس کے بارے میں جب بھی ہم سوال کرتے ہیں آپ جواب نہیں دیتے، ادھر ادھر کی باتوں میں ہماری بات ٹال جاتے ہیں —“ تیسرے بیٹے عابد نے پوچھا۔

”آپ اس رقم کا کیا کریں گے؟“ سب سے چھوٹے بیٹے نے سوال کیا۔

”آپ ہماری الجھن دور کریں، ہم آپ سے

وہ رقم نہیں مانگتے۔"

"سنو میرے بچو! ماحول اور معاشرہ بدل چکا ہے اسلامی تعلیمات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پہلے جب دینی ماحول ہوتا تھا، اس وقت والدین اپنی اولاد کے حقوق پورے کرتے تھے اور اولاد بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہوتی تھی لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے، ایک ایک پیسہ جو میں جوڑ رہا ہوں اس رقم سے میں مستقبل قریب میں ایک چھوٹا سا ایک یا دو کمروں پر مشتمل مکان خریدنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ مکان تو ہمارے پاس ہے آپ نیا مکان کیوں خریدنا چاہتے ہیں؟" چاروں نے یک زبان ہو کر کہا۔

ان کے چہروں پر حیرت ہی حیرت تھی، جب کہ باپ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"اس مکان کے چار کمرے ہیں اور چار ہی تم ہو، جب تمہاری شادیاں ہو جائیں گی، بال بچے ہوں گے تو پھر تم مجھے گھر سے نکال دو گے۔"

"نن ..... نن ..... نہیں ــــ" اسلم فوراً بولا۔

"ابا جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" عابد نے حیران ہو کر کہا۔

"بھلا کہیں بیٹے بھی باپ کو نکالا کرتے ہیں؟" سب سے چھوٹے بیٹے نے کہا۔

"اس دور میں ایک باپ تو اپنے چار بچوں کو پال سکتا ہے لیکن چار بچے..... چار کڑیل جوان ایک باپ کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔"

"ابا! آپ کو وہم ہو گیا ہے۔" اکرم بولا۔

"نہیں، میں دیکھتا ہوں تم جیسے جوان اپنے بچوں کی تعلیم کا بوجھ تو برداشت کرتے ہیں، ان کے علاج پر توجہ دیتے ہیں، ان کے لئے پھل لاتے ہیں، لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ والدین کے ساتھ بھی پیٹ لگا ہوا ہے، وہ بھی بیمار ہوتے ہیں وہ بھی پھل کھانا اور دودھ پینا چاہتے ہیں لیکن آج کل کی اولادیں ماں باپ کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ میں اپنے اس بُرے وقت کا بندوبست کر رہا ہوں۔"

"ہم اپنے باپ کے ساتھ برا سلوک نہیں کر سکتے۔"

"جو والدین اپنی زندگی میں اپنا سب کچھ اولاد کے نام کر دیتے ہیں، اگر ان کی اولاد بُری نکل جائے تو ایسے والدین گلیوں یا فٹ پاتھوں پر نظر آتے ہیں، میں یہ مکان تمہارے نام کروں گا لیکن اپنے لئے الگ مکان ضرور لوں گا۔ میں تمہاری آج کی باتوں میں آ کر اپنے بڑھاپے کو عذاب نہیں بنا سکتا، کیوں کہ کل تمہاری نیت اور ہو گی۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــــ" چاروں زور دار انداز میں بولے۔

"تم ابھی بچے ہو ــــ" رحمت علی کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی جیسے وہ مستقبل میں اپنے بچوں کی بدلی ہوئی نیت دیکھ رہا ہو۔

پیٹو میاں نے دعوت اڑائی

عبدالقادر

شکوہ کریں تو ہو گی اپنی ہی جگ ہنسائی — ہم سے ہوئی حماقت، اس کی سزا بھی پائی
دعوت کا کہہ دیا تھا پیٹو میاں کو ہم نے — "کل رات میرے گھر میں آنا ضرور بھائی"
سمجھو اسے حماقت، چاہے کہو سخاوت — آپس میں ہے ہماری برسوں سے آشنائی
میزوں پہ چن رکھے تھے پکوان سو طرح کے — پیٹو میاں نے آکر بریانی پہلے کھائی
مرغوں کی بیس رانیں کھائیں مزے مزے سے — زردہ، پلاؤ کی پھر منٹوں میں کی صفائی
قیمہ بھرے کریلے اور شیر مال ٹھونسے — دس نافتان کھائے، پھر آستیں چڑھائی
بکری کا قورمہ بھی ہم نے پکا لیا تھا — انصاف جب کیا تو وہ دیگچی اڑائی
بیسن کی روٹیوں کا انبار سامنے تھا — پیٹو میاں نے اس پر اپنی نظر جمائی
چھ ڈونگے کوفتوں کے روٹی کے ساتھ کھائے — شامی کباب پر کی پیٹو نے پھر چڑھائی
سرکہ، سلاد، مولی اور رائتہ شکم میں — پہنچا دیئے تو کھائی چمچے سے رس ملائی
تل کر رکھے تھے ہم نے قتلے جو مچھلیوں کے — ان کو ہڑپ کیا تو حلوے کی باری آئی
انڈے، اچار، جیلی، کسٹرڈ اور مربے — ممکن نہیں تھا ان سے "اظہار بے وفائی"
دو قاب فیرنی کے جو سامنے رکھے تھے — پہنچا دیئے شکم میں، تب اک ڈکار آئی
چٹخارے لے کے کھائی املی کی ترش چٹنی — مرغی کا سوپ پی کر کچھ چھالیہ چبائی
زریں قول دے کر رخصت ہوئے یہاں سے — "کچھ بھوک بچ رہے تو اس میں نہیں برائی"

کیسے کریں گزارہ، آتا نہیں سمجھ میں
دعوت میں پار کر دی اس ماہ کی کمائی

شاکا مرخی کی پٹائی

نعیم مشتاق نومی

دوسرا اور آخری حصّہ

"یہ تو سوچنا پڑے گا......!" چوہدری بولا۔ "مجھے ...... آپ کو...... ہم سب کو......!" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے...... کیوں نہ پہلے شاکا مرخی سے بات کی جائے؟ ...... کہ تو نے جس تھالی میں کھایا ہے، اس میں چھید کیوں کر رہا ہے؟"

"یہ تو بیکار کی کوشش ہے ......!" ایک شخص بولا۔

"کیوں؟ ...... بیکار کیسے ہے؟"

"چوہدری صاحب! ...... ہم نے اس سے بات کی تھی ...... مگر اس نے الٹا ہمیں بُرا بھلا کہا ...... اور یہ بھی کہا ...... اگر ہمیں زیادہ تکلیف ہے تو ہم یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں ......!" اسی شخص نے جواب دیا۔

"یہ تو بڑی زیادتی ہے......!" چوہدری نے کہا۔

"چوہدری صاحب! ..... اگر اس زیادتی کا ازالہ نہ ہوا تو ہم بھوکے مر جائیں گے.....!" ایک اور شخص بولا۔

"مایوسی کی بات نہ کرو میرے بھائی!" چوہدری نے کہا۔ "جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی حل بھی ہوتا ہے..... جو کہ صرف اور صرف مل بیٹھ کر سوچنے سے سامنے آتا ہے لڑنے سے یا پریشان ہونے سے نہیں۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر بعد اچانک چوہدری اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس کے لبوں سے جوشیلی آواز نکلی۔ "سچ ہی کہتے ہیں ..... کوشش میں کامیابی ہے!"

"لگتا ہے ..... چوہدری جی کو کچھ سوجھ گیا ہے" مجمعے میں سے ایک مسرت بھری آواز سنائی دی۔

"ہاں!" چوہدری نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہماری مشکل کا سادہ سا حل یہ ہے کہ ہم دریا پر ایک نیا پل بنا لیں ..... نہ کسی سے لینا، نہ دینا"

چوہدری کے اس خیال کی سب نے تائید کی اور خوب سراہا۔

اگلے دن نئے پل کا کام شروع ہو گیا۔ گاؤں کے تمام لوگوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کچھ ہی دنوں میں نیا پل تیار ہو گیا۔ جس دن پل تیار ہوا، اس دن لوگ بہت خوش تھے۔ چوہدری نے اس خوشی کا اظہار یوں کیا کہ تمام گاؤں والوں کی دعوت کی۔ اور انواع و اقسام کے کھانے پکا کر انہیں کھلائے۔

مگر..... اگلے دن جب لوگ پل پر پہنچے تو پل زمین بوس ہو چکا تھا۔ اور اس کی حالت بتاتی تھی کہ وہ خود نہیں گرا بلکہ گرایا گیا ہے۔

چند آدمی بھاگے بھاگے چوہدری کے پاس پہنچے۔ اور اسے پل کے بارے میں بتایا۔

"کس نے کیا ہے یہ سب کچھ .....؟" چوہدری کو غصہ آ گیا۔

"کیا پتا چوہدری صاحب؟" ایک آدمی نے جواب دیا۔ "آپ ایک دفعہ خود چل کر دیکھ لیں!" دوسرا بولا۔

"چلو.....!" چوہدری نے کہا۔ اور فوراً ان کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔ کچھ دیر بعد وہ زمین بوس پل کے قریب کھڑا تھا۔

پل کو گرایا گیا تھا۔ اور یہ کسی طاقتور شخص کا کام تھا۔ وہ حیران تھے کہ ایسا کون کر سکتا ہے؟ کیونکہ ان کا کوئی بھی دشمن نہیں تھا۔ اور قریب ترین گاؤں بھی وہاں سے کافی دور تھا۔ لہٰذا ان کا پریشان اور حیران ہونا قدرتی امر تھا۔

سوچتے سوچتے اچانک انہیں شاکا مرخی کا خیال آیا۔ "یہ کارستانی کہیں اس کی نہ ہو؟" یہ سوچ کر وہ سب اس کے پاس پہنچ گئے۔

"جی فرمائیے .....!" شاکا مرخی مسکرا کر بولا۔

"کیا تم نے ہمارا پل گرایا ہے .....؟" چوہدری نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! میں نے گرایا ہے.....!" وہ تحریہ انداز میں بولا۔

"کیوں؟....." چوہدری کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ دوسرے لوگ بھی غصے سے کھولنے اور اسے گھورنے لگے۔ مگر وہ لاپرواہی سے مسکرا رہا تھا۔ "اس لئے کہ جب ایک پل موجود ہے تو دوسرے کی کیا ضرورت.....؟" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب.....؟" وہ چونکا بلکہ سب ہی چونکے۔

"مطلب یہ ہے کہ پہلے بھی ایک پل تھا، اب بھی ایک پل ہی رہے گا.....!" شاکا مرخی لاپرواہی سے بولا۔

"تو کیا تم اب ہمیں اس پر سے گزرنے دیا کرو گے.....؟" چوہدری نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بالکل نہیں.....؟" اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر تم نے ہمارا دوسرا پل کیوں گرایا.....؟" چوہدری نے اپنے غصہ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ پل میں نے اس لئے گرایا..... کیونکہ دریا کے دوسری طرف موجود تمام فصلیں، تمام پھل، تمام سبزہ میرا ہے.....!" اس نے جواب دیا۔ "اور اپنی تمام چیزیں اگر میں تم لوگوں کو استعمال کرنے کی اجازت دے دوں تو خود کہاں سے کھاؤں۔"

"ارے بے وقوف انسان!" چوہدری نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "جب یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا تو پھر کیا کرے گا؟..... بل جوت سکے گا؟..... واہی بیجی کر لے گا؟..... اس وقت کیا کرے گا؟..... کہاں سے کھائے گا تو؟"

"جب ایسا ہو گا تو دیکھا جائے گا!" وہ لاپرواہی سے کندھے جھٹک کر بولا۔ "فی الحال آپ لوگ جائیں..... میرے آرام کا وقت ہو رہا ہے!" اس نے کہا۔ اور پل کے نیچے چلا گیا۔

"عجیب سینہ زوری ہے.....!" ایک بوڑھے نے اپنے غصے اور بے بسی کا اظہار کیا۔

ایک شہ زور جوان بولا۔ "چوہدری صاحب! مجھے اجازت دیں..... میں ابھی اس کی گردن مروڑ کر رکھ دوں گا.....!" وہ سخت غصے میں تھا۔

"میرے بھائی!" چوہدری نے نرم لہجے میں اس نوجوان سے کہا۔ "کسی کی جان لینا صرف اور صرف ایک ہی ذات کو زیب دیتا ہے..... اور وہ ہے خدا کی ذات..... ہم گناہگاروں کو ایسی بات بھول کر بھی نہیں کرنا چاہئے.....!"

"چوہدری صاحب! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر کوئی ہمارے ساتھ زیادتی کرے تو ہم خاموشی سے دیکھتے رہیں!" ایک شخص نے کہا۔

"نہیں..... بالکل نہیں!" چوہدری مسکرا کر بولا۔ "ہمیں صبر و تحمل کے ساتھ اسے سمجھانا چاہئے!"

"اور اگر وہ نہ سنے تو.....؟"

"اگر وہ نہ سنے تو اس کے لئے دعا کرنی چاہئے کہ اے خدا! اسے ہدایت فرما۔ اسے سیدھا رستہ دکھا!"

ایک بوڑھا بولا۔ "چوہدری صاحب! دوسری باتیں چھوڑیں، یہ سوچیں کہ اب ہم کیا کریں؟ ..... کیسے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کریں؟"

سب نے سر ہلا کر اور زبان سے بول کر اس بات کی تائید کی۔

"آؤ میرے ساتھ.....!" چوہدری نے کہا۔ اور پورے گاؤں کو لے کر کھلے میدان میں پہنچ گیا

..... "آیئے.....!" اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔ "ہم سب مل کر خدا کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کریں۔ اور اس سے التجا اور فریاد کریں کہ ہمیں وہ اس آزمائش سے نکالے.....!"

تب سب نے مل کر خدا کے حضور اپنے سر جھکائے۔ صدق دل سے فریاد کی۔ دعا مانگی۔ اور اس ذاتِ لاثانی کو سجدہ کیا۔

دعا مانگنے کے بعد چوہدری نے تمام گاؤں والوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "اب آپ اطمینان سے گھر جائیں، اور آرام کریں..... خدا ہماری دعاؤں کا جواب ضرور دے گا..... اور جلد دے گا..... کیونکہ وہ اپنے لوگوں کو مصیبت اور مشکل گھڑی میں تنہا کبھی نہیں چھوڑتا..... ہمیشہ ان کی مدد کرتا ہے!"

سب گاؤں والے اپنے گھروں میں چلے گئے۔

اگلے دن صبح سویرے کسی نے چوہدری کے دروازے پر دستک دی۔ چوہدری نے فوراً اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر تین آدمی کھڑے تھے۔ ایک چھوٹا، دوسرا اس سے بڑا۔ اور تیسرا سب سے بڑا۔ ان کی شکل و صورت کچھ کچھ شاکا مرخی سے ملتی جلتی تھی۔ "جی فرمایئے.....!" چوہدری نے نرم اور شائستہ لہجے میں کہا۔

"یہاں کچھ عرصہ پہلے کوئی اجنبی تو نہیں آیا تھا؟" سب سے بڑا آدمی بولا۔ "بالکل ہمارے جیسا..... ہمارے جیسی شکل والا!....."

"کہیں آپ شاکا مرخی کی بات تو نہیں کر رہے؟" چوہدری نے پوچھا۔

"جی..... جی ہاں! اس نے سر ہلایا "کہاں ہے وہ؟..... کیا آپ جانتے ہیں؟....."

جی ہاں.....!" چوہدری نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر برائے مہربانی اس کا پتا دیجئے.....!"

"پتا کیا بتانا ہے.....؟" وہ اسی گاؤں میں رہتا ہے۔"

"کیسا رویہ ہے اس کا اب؟"

"بہت بُرا.....!" چوہدری نے تفصیل سے بتایا۔ آخر میں اس نے پوچھا۔ "آپ لوگ ہیں کون؟..... اور آئے کہاں سے ہیں؟....."

"ہمارا تعلق سیارہ مریخ سے ہے، اور ہم شاکا مرخی کو دیکھنے آئے ہیں!" اس نے جواب دیا۔

"اب آپ ہمیں اس کے پاس لے چلیں!"

"کیوں نہیں؟ ..... آیئے میرے ساتھ۔" چوہدری نے کہا۔ اور انہیں لے کر پل کی طرف چلا گیا۔

"وہ یہاں پل کے نیچے رہتا ہے!" پل کے پاس پہنچ کر چوہدری نے بتایا۔

"مہربانی .....!" بڑے نے ہاتھ ملایا۔

"اب آپ بے شک چلے جائیں .....!" اس نے کہا۔ پھر چھوٹے کو اس نے اشارہ کیا۔

چھوٹا اشارہ پا کر پل پر چلا گیا..... کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ..... اس کے جوتوں کی آواز ابھری۔ اور پل کے نیچے سویا ہوا شاکا مرخی جاگ اٹھا۔ اس کی کرخت اور غصیلی آواز گونجی ..... "یہ کس کی موت آئی ہے؟ ..... کون ہے پل پر؟"

"یہ میں ہوں ..... چھوٹا .....!" چھوٹا باریک آواز میں بولا۔

"واپس چلے جاؤ! ..... ورنہ میں تمہیں کھا جاؤں گا!" شاکا مرخی دھاڑا۔

"مجھے کھا کر تمہارا کیا بنے گا؟ ..... میں تو بس چھوٹا سا ہوں ..... مگر میرے پیچھے جو آرہا ہے، وہ مجھ سے صحت مند اور بڑا ہے!" چھوٹے نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے! ..... شکل گم کرو اپنی۔" وہ چیخا۔ اور چھوٹا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا پل کے دوسری طرف پہنچ گیا۔

تب بڑے نے درمیانے آدمی کو اشارہ کیا۔ اشارہ پا کر درمیانہ آدمی پل پر پہنچ گیا۔ ایک بار پھر آواز ابھری ..... کھٹ کھٹ ..... کھٹ کھٹ ..... ایک بار پھر شاکا مرخی کی کرخت اور غصیلی آواز گونجی "یہ کس کی موت آئی ہے؟ ..... کون ہے پل پر؟ ....."

"یہ میں ہوں! ..... درمیانہ .....!"

درمیانہ، درمیانی آواز میں بولا۔

"واپس چلے جاؤ! ..... ورنہ میں تمہیں کھا جاؤں گا .....!" شاکا مرخی دھاڑا۔

"مجھے کھا کر تمہارا کیا بنے گا؟ ..... مگر میرے پیچھے جو آرہا ہے۔ وہ مجھ سے بہت صحت مند اور بہت بڑا ہے!" درمیانے نے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے! ..... شکل گم کرو اپنی .....!" وہ چیخا۔ اور درمیانہ، درمیانے قدم اٹھاتا پل کے دوسری طرف پہنچ گیا۔

تب سب سے بڑا آدمی خود پل پر پہنچ گیا..... پل کی چولیں ہلنے لگیں..... بھاری قدموں کی آواز گونجی..... ٹپاٹپ کھناکھٹ..... ٹپاٹپ کھناکھٹ.....

"یہ کون ہے پل پر؟ ..... کس بدبخت کی موت آئی ہے میرے ہاتھوں؟ ....." شاکا مرخی غصہ میں آگ بگولا ہو گیا۔

"یہ میں ہوں! ..... سب سے بڑا! ....."

بڑے نے جواب دیا۔

"واپس چلا جا!..... ورنہ میں تجھے کھا جاؤں گا!"

شاکا مرخی دھاڑا۔

"کون کس کو کھائے گا؟..... یہ فیصلہ تو تب ہو گا، جب تو سامنے آئیگا.....!" بڑے نے کہا۔ اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا ہوا پل کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ شاکا مرخی غصے سے پھنکارتا ہوا پل کے نیچے سے باہر نکل آیا۔ مگر جب اس نے ان تینوں کو سامنے پایا تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔

اس نے فوراً گرگٹ کی طرح رنگ بدلا، "میں تو مذاق کر رہا تھا.....!" وہ ہنس کر بولا۔

"تو واقعی کتے کی دُم ثابت ہوا ہے!" سب سے بڑا دانت پیس کر بولا۔ "تم جیسے ہی لوگ ہوتے ہیں..... جن کو خدا توبہ کا موقع جب فراہم کرتا ہے تو وہ فوراً توبہ کر لیتے ہیں..... مگر جیسے ہی حالات ٹھیک ہوئے، ان کے اندر کی اصلیت پھر باہر آنے لگتی ہے..... وہ پھر سے پرانی روش پر آجاتے ہیں اور خدا کی گرفت کو بھول جاتے ہیں..... یہ بھول جاتے ہیں کہ خدا ظالم کی رسی اس لئے دراز کرتا ہے..... تا کہ وہ توبہ کر لے..... مگر افسوس!"

تب بڑے نے چھوٹے اور درمیانے کو اشارہ کیا۔ اور تینوں یک دم شاکا مرخی پر پل پڑے۔

شاکا مرخی منتیں کرتا رہا، واسطے دیتا رہا، معافی مانگتا رہا، مگر ان تینوں کے جیسے کان ہی بند ہو چکے تھے۔ وہ اسے مارتے رہے..... مارتے رہے مارتے رہے.....

چوہدری کے منہ سے بے اختیار ٹھنڈی سانس نکلی۔ اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ اسے شاکا مرخی کے انجام کا بہت دکھ ہوا تھا..... مگر..... یہ تو ہوتا آیا ہے..... جو جیسا کرتا ہے، ویسا ہی بھرتا ہے.....!!!

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں _____

رقم _____ بذریعہ _____

پتہ _____

_____

فون نمبر _____

آمنے سامنے

سلیم خالق

اسٹار کھلاڑیوں سے سوال جواب کا دلچسپ سلسلہ

جارح مزاج لیفٹ ہینڈ بیٹسمین سعید انور کے لئے بچوں کے ڈھیروں خطوط موصول ہوئے۔ میں نے جب انہیں خطوط کا ڈھیر دکھایا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ وقت کی کمی کے باعث سعید انور سے صرف ان خطوط کے جوابات لئے گئے جو وقت پر موصول ہوئے تھے اور ساتھ ہی دلچسپ بھی تھے۔ بہت سے بچوں نے اپنے خطوط میں روایتی قسم کے سوالات پوچھے تھے مثلاً آپ کب پیدا ہوئے؟ آپ کا زیادہ سے زیادہ اسکور کیا ہے وغیرہ ۔ ان سوالوں کے جواب کے لئے کھلاڑیوں کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے یہ تو آپ خط لکھ کر ہم سے بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ سوالات بھیجتے ہوئے یاد رکھیئے کہ سوالات مزیدار اور تنقیدی ہوں ہم نے آمنے سامنے کے لئے سعید انور سے نیو گارڈن ٹاؤن لاہور میں ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی اور آپ کے سوالوں کے جواب ان سے لئے۔

انعام یافتہ

سوال: سعید انکل، اگر آپ جنگل میں اکیلے ہوں اور آپ کے پاس بندوق بھی نہ ہو اور اچانک کہیں سے ایک خوفناک شیر آ جائے تو آپ کیا کریں گے؟ سید شیر شاہ، گجرات (انعام یافتہ)

سعید انور: ایسے میں کرنے کے لئے رہ کیا جائے گا۔ فوراً اپنے گناہوں کی معافی اللہ سے مانگوں گا اور کلمہ پڑھوں گا۔

سوال: سعید بھائی ہم آپ سے سخت ناراض ہیں۔ کیونکہ آپ نے ۳۶۵ رنز نہیں بنائے اور لارا ۳۷۵ رنز کر گیا۔ خیر اب سری لنکا کے دورے

میں ۴۰۰ رنز بنا کر اپنے پرستاروں کو خوش کر دیں؟ (لعل بخش شیخ، مانجھی پور)

سعید انور: اف، ۴۰۰ رنز، خیر اب آپ نے کہا ہے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ آپ بھی میرے لئے دعا کیجئے گا۔

سوال: سعید بھائی اپنی زندگی کا کوئی خوشگوار واقعہ بتائیے؟ (خالد احمد پاشا، کراچی۔)

سعید انور: بہت سے واقعات ہیں۔ شارجہ میں تین لگاتار سنچریاں، آپ اسی کو خوشگوار واقعہ سمجھ لیں۔

سوال: سعید بھائی اگر کوئی آپ سے کہے کہ اتنے لاکھ روپے دوں گا۔ کرکٹ کھیلنا چھوڑ دو تو آپ اسے کیا جواب دیں گے؟

سعید انور: میرا جواب ذرا دوسرے قسم کا ہو گا۔ اور یہ جواب میں جوتے کے تسمے کھول کر دوں گا۔ کیونکہ میں دولت کیلئے اپنے وطن سے غداری نہیں کر سکتا۔

دل دیا ہے جاں بھی دیں گے اے وطن تیرے لئے !!

سوال: سعید بھائی اگر گلیوں میں کھیلنے والا بچہ محنت کرے تو کیا وہ سعید انور بن سکتا ہے؟ نوید الرحمان، کراچی۔

سعید انور: کیوں نہیں، آخر ملیر کی گلیوں میں کھیلنے والا بچہ ہی تو بڑا ہو کر سعید انور بنا۔ بس اس کیلئے ضروری ہے کہ دل میں لگن اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ موجود ہو۔

انعام یافتہ

سوال: سعید بھائی اگر کسی میچ کے شروع ہونے سے قبل ویسٹ انڈیز کا کالا بولر کرٹلے ایمروز آپ کے پاس آئے اور کہے کہ سعید یار میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں تمہیں میرے لمبے قد کی قسم پیچ میں لمبے لمبے چوکے نہ لگانا تو آپ اسے کیا جواب دیں گے؟ (خرم نذیر وڑائچ)، لاہور

سعید انور: اگر بیچارا ایمروز ایسا کرے تو اس کا کچھ تو خیال کرنا پڑے گا ناں ویسے بھی پچھلے شارجہ کپ میں باسط نے بیچارے کی بڑی مار لگائی تھی۔ خیر اگر ایمروز اتنا اصرار کرے گا تو اس کی بات مان لیں گے اور اسے لمبے لمبے چوکے نہیں لگائیں گے۔ بلکہ اونچے اونچے چھکے ماریں گے۔ کیا خیال ہے؟

سوال: سعید بھائی آپ کی شاندار بیٹنگ کا راز کیا ہے؟ (کھتری محمد فاروق، کراچی، حماد عثمانی، کراچی۔)

سعید انور: یہ تو راز کی بات ہے آپ کو کیسے بتا دوں، خیر آپ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو سنیں۔ سخت محنت اور لوگوں کی دعائیں۔

سوال: سعید بھائی ون ڈے کرکٹ میں ڈبل سنچری بنانے کا کب تک ارادہ ہے؟ (فرزانہ رفیق، غریب وال)

سعید انور: بس آپ لوگ دعائیں کرتے رہیں۔

انشاءاللہ جلد ہی آپ کی یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔

سوال: سعید بھائی آپ کو کس قسم کے بچے پسند ہیں؟ (احمد علی، لاڑکانہ)

سعید انور: بچے تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے وہ بچے اچھے لگتے ہیں جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جن میں ادب، احترام اور اخلاق ہے اور جو دنیا میں اچھے اور بڑے کام کرنا چاہتے ہیں۔ جنہیں پڑھنے کا شوق ہے۔

سوال: سعید بھائی سنا ہے آپ خاصے پڑھاکو قسم کے بچے تھے یہ آپ نے پڑھائی اور کھیل کے درمیان توازن کیسے پیدا کیا ہوا تھا؟ (سمن فرح، اسلام آباد)

سعید انور: کیوں بھئی سنا ہے سے کیا مطلب ہے آپ کا۔ کیا میں آپ کو شکل سے پڑھا لکھا نہیں لگتا ہوں۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ پڑھائی کے زمانے میں دوست اچھے مل گئے تھے وہ مدد کرتے تھے ساتھ ہی میں محنت بھی کرتا تھا اور میرے خیال میں انسان اگر محنت کرے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

سوال: سعید بھائی شارجہ میں آپ نے تین لگاتار سنچریاں جب اسکور کیں تھی تو اس وقت آپ کے کیا تاثرات تھے؟ (سہیل احمد ثاقب، کراچی)

سعید انور: لازمی بات تھی بہت خوش تھا۔ میں نے اسی وقت اپنے گھر فون کر کے اپنے گھر والوں سے بات کی تھی۔ کیونکہ میرے خیال میں میں جو کچھ بھی ہوں ان ہی کی وجہ سے ہوں۔

انعام یافتہ

سوال: سعید بھائی کیا بات ہے یہ آپ گدھوں کو دیکھ کر اتنا شرما کیوں جاتے ہیں؟ (عامر سلمان، لاہور)

سعید انور: یہ تجربہ آپ کو کیسے ہوا؟ میری آپ کی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟؟

سوال: سعید بھائی میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لئے میں نے کھانے کا آرڈر بھی دے دیا ہے۔ مینو ذرا آپ بھی سن لیجئے۔ دو دیگیں چکن قورمہ، چار دیگیں بریانی، ۳ دیگیں بکرے کا قورمہ، ۵۰۰ چکن تکے ۱۰۰۰ روٹیاں، سو کریٹ کولڈ ڈرنک، ۱۰۰ کلو دودھ کی کھیر اور ہاں کھانے کے بعد آپ کے لئے کار مینا کی ۱۰۰ شیشیاں بھی موجود ہوں گی۔ اس لئے بے فکر ہو کر آجائیں۔ تو آپ آرہے ہیں نا؟ (جاوید، مقام نامعلوم)

سعید انور: واہ بھائی، آپ نے بھی خوب تیر چلائے ہیں اتنا اچھا مینو بتایا کہ منہ میں پانی بھر آیا۔ لیکن دعوت کے مقام کے بارے میں لکھنا ہی بھول گئے خیر اب جلدی سے اپنا ایڈریس بھیجئے تاکہ میں اپنے ایک سو دوستوں کے ساتھ اتنی اچھی دعوت میں پہنچوں۔

آمنے سامنے کے اگلے مہمان،
جہانگیر خان، شعیب محمد، انضام الحق

بنام آنکھ مچولی

سید طاہر رضا بخاری، لالیاں۔ جولائی کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح شاندار تھا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں لائٹ دلچسپ تھے۔ "وہ کیا راز تھا" کی ساتویں قسط اچھی لگی۔ اب آنکھ مچولی کے خاص نمبر کا انتظار ہے۔

حسیب احمد، جہلم کینٹ۔ آپ کا پچھلا شمارہ حسب معمول بے حد زبردست تھا۔ آپ میری تحریریں کب چھاپ رہے ہیں؟ ○ ..... آپ کی کچھ مرسلہ تحریریں بدی آنے پر قلم دوست میں شائع کر دی جائیں گی۔ نسیم سلطان، کراچی۔ جولائی کا شمارہ اس بار مہینے کے اختتام سے پہلے ہی مل گیا۔ سرورق بے حد پسند آیا۔ مضامین میں "اے بت میں تیرا پجاری نہیں" اور "ریورس سوئنگ" پسند آیا جب کہ "سرحد کے اس پار" میں ہمیں کوئی غلطی نظر نہ آئی۔ کہانیوں میں "زندگی کی واپسی" اور "شناکا مرغی کی پٹائی" اچھی لگی۔ نظموں میں جناب عبدالقادر صاحب کی نظم "بستہ ہے میرا وزنی" اور جناب جاوید خالد کی نظم "کیا کرنا ہے مجھ کو پڑھ کے" بازی لے گئی۔ لیاقت علی پروانہ، کراچی۔ جولائی کا سرورق بڑا ہی دلچسپ تھا۔ "سنہرے حروف" "ماہ رواں کی پہلی بات" "اے بت میں تیرا پجاری نہیں" اثر انگیز تحریریں تھیں۔ کہانیوں میں "سرحد کے اس پار" "نٹ کھٹ کی ایک کہانی" اور تم تو لڑکی ہو" بہت پسند آئیں۔ "آمنے سامنے" بہترین سلسلہ ہے۔ محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ "سات بہنیں سات بھیڑیے" "نور جہاں بیگم" "ندامت" "پرود گار عالم" "ایک تھے جگری یار ہمارے" اور "بستہ ہے میرا وزنی" بے حد پسند آئیں۔ قلم دوست میں "انکل خالد بچ گئے" اچھی لگی۔ جاوید میانداد صاحب سے ملاقات پسند آئی۔ "سرحد کے اس پار" نے البتہ متاثر نہیں کیا۔ حنا عروج قریشی، سانگھڑ۔ اس بار شمارہ پچیس تاریخ کو ہی مل گیا۔ "شناکا مرغی کی پٹائی" "زندگی کی واپسی" "تم تو لڑکی ہو" اور

ایک خط ایک مسئلہ

جناب مدیر آنکھ مچولی

السلام علیکم!

آپ کے رسالے کے توسط سے میں آپ کی توجہ اس طرف دلا چاہتا ہوں کہ ہمارے ابو مولوی طاہر ولد محمد شریف جو کہ بے گناہ ہیں اس وقت سنٹرل جیل، ہری پور میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ ابو کے جیل جانے کی وجہ سے ہم لوگ کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اخبارات میں اشتہارات شائع ہوتے ہیں کہ "مستحق لوگوں کو زکوٰۃ دیں۔" میں کہتا ہوں کہ جیلوں میں بے یار و مددگار پڑے قیدی ہی زکوٰۃ کے اصل مستحق ہیں۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے زبانی جمع خرچ کے علاوہ ہمارے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ اس مصیبت کے وقت پشاور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر قاضی محمد انور ایڈووکیٹ نے ہمارے لئے پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا ہے۔ میں ماہنامہ آنکھ مچولی کے صفحات سے وزیر اعظم اور گورنر صوبہ سرحد سے اپیل کرتا ہوں کہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ہمارے ابو مولوی محمد طاہر کو رہا کیا جائے اور جب تک وہ رہا نہیں ہو جاتے..... ہمارے لئے وظیفہ مقرر کیا جائے!!

عبد الرحمٰن، سوات۔

"نٹ کھٹ کی کہانی" اچھی لگیں۔ "وہ کیا راز تھا" ایک اچھی کاوش ہے۔ کلینڈر کا تحفہ پسند آیا ہے۔ **عبد الرافع، رحیم یار خان۔** مجھے آپ کا رسالہ بے حد پسند ہے اس کے لئے ایک لطیفہ بھیج رہا ہوں امید ہے دل نہیں توڑیں گے۔ **سنیل پرویز، کراچی۔** جولائی کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ کہانی "سرحد کے پار" بازی لے گی۔ **عثمان تنویر ملک، لاہور۔** جولائی کے شمارے میں اسکولوں میں مار پیٹ کا ذکر کیا گیا۔ ہمارے اسکول میں بھی پچھلے دنوں ایک طالب علم سے اردو کی کتاب غلطی سے نیچے گر گئی تو استاد نے اپنی بیلٹ سے اسے بری طرح مارا پیٹا۔ استادوں کو اپنے شاگردوں سے پیار و محبت اور نصیحت آمیز برتاؤ کرنا چاہئے تاکہ ذرا ذرا سی بات پر انہیں دھنک کر رکھ دیں!! **محمد راشد اقبال، کراچی۔** اس بار تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ "شاکا مرغی کی پٹائی" اور "وہ کیا راز تھا" پڑھ کر مزا آگیا۔ **فہیم حیدر، کراچی۔** معلوماتی مضمون "ج سے جہاز" پسند آیا۔ لطائف غیر معیاری تھے۔ بنام آنکھ مچولی پسند نہیں آتا کیوں کہ آپ خطوں کو مختصر کر دیتے ہیں۔ **عبد الجبار، لاہور۔** پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں۔ اس بار لطائف بہت مزے دار تھے۔ کہانیوں میں "سرحد کے اس پار" اور "نٹ کھٹ کی ایک کہانی" بہت پسند آئی۔ **عبد المجید عثمانی، جھنگ شہر۔** اڑدھے کا لنچ" اور "مزے دار گھونسلے" واقعی مزے دار تحریریں تھیں۔ **طارق وحید، تخت بھائی۔** آنکھ مچولی میں روز بروز بچکانہ تحریروں کا اضافہ ہو رہا ہے کہیں آپ اسے چھوٹے بچوں کا رسالہ بنانے پر تو نہیں تلے ہوئے ہیں؟ ○ ..... بھئی! آنکھ مچولی تو ہے ہی بچوں کا رسالہ۔ **عابد انور، کراچی۔** "اڑدھے کا لنچ" "مزے دار گھونسلے" "صحت کیسے بنتی ہے" "سچ مچ کی گڑیا" "ج سے جہاز" "رنگ برنگے جوتے" اور "سائنس نیوز فرنٹ" نے رسالے میں چار چاند لگا دیئے۔ "جناب احمد حاطب صدیقی کی تحریر "تم تو لڑکی ہو" شمارے کی بہترین تحریر تھی جب کہ نظموں میں "کیا کرنا ہے مجھ کو پڑھ کے" شاندار رہی۔ **زرمینہ**

مرتضیٰ پشاور۔ جولائی کا شمارہ دلکش سرورق کے ساتھ ملا۔ کلینڈر کا تحفہ پسند آیا۔ پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک لاجواب تحریریں تھیں۔ "وہ کیا راز تھا" ایک ہی سانس میں ختم کی۔ کھلاڑیوں سے سوال و جواب کا نیا سلسلہ پسند آیا۔ ثمینہ حبیب علی، لاہور۔ "سرحد کے پار" اچھی کہانی تھی لیکن مصنف نے جاسوس کو سرحد کے پار کراتے ہی "پار" لگا دیا۔ باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے۔ آخری بات اچھی لگی۔ اب خاص نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔ شہزادہ شہزادہ التمش، لاہور جولائی کا سرورق بہترین ہے۔ سعدیہ، سارہ اسرار، کراچی۔ جب سے نیا سال شروع ہوا ہے آنکھ مچولی پھیکا پھیکا سا ہو گیا ہے۔ سیدہ کاشفہ کراچی۔ "ریورس سوئنگ" پڑھ کر اپنے کھلاڑیوں پر فخر محسوس ہوا۔ خاص نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے۔ سیدہ صدف عرفان، اسلام آباد۔ عبدالقادر صاحب کی نظم "بستہ ہے میرا وزنی" بہت مزے کی لگی۔ کہانیوں میں "شاکا مرغی کی پٹائی" "ندامت" اور "سرحد کے اس پار" پسند آئیں۔ "وہ کیا راز تھا" میں تجسس بڑھتا جا رہا ہے۔ انکل! آپ نے خاص نمبر کے لئے مزے دار سروے کا ذکر کیا ہے کیا یہ سروے صرف کراچی ہی کے بچوں سے لیا جائے گا؟ نوشابہ اکرم، رحیم یار خان۔ جولائی کا سرورق بہت اچھا لگا۔ کہانیوں میں "تم تو لڑکی ہو" بے حد پسند آئی۔ سالنامے کا شدت سے انتظار ہے۔ ایم۔ اے قریشی، اسلام آباد۔ "شاکا مرغی کی پٹائی" اور "سرحد کے اس پار" کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکیں جب کہ "وہ کیا راز تھا" بھی اس مرتبہ کوئی خاص نہ تھی۔ حافظ حذیفہ، ملتان۔ نظموں میں "ایک تھے جگری یار ہمارے" "پروردگار عالم" "بستہ ہے میرا وزنی" بہت پسند آئیں۔ میانداد سے سوال جواب کا سلسلہ اچھا لگا۔ امتیاز علی میمن، لاڑکانہ۔ جولائی کے شمارے میں "اے بت! میں تیرا پجاری نہیں" نے بہت متاثر کیا۔ "مزے دار گھونسلے" "شاکا مرغی کی پٹائی" "سرحد کے اس پار" اور "نور جہاں بیگم" بہت پسند آئیں۔ مونا ملک، بہاولپور۔ جولائی کے شمارے میں یاسر بن نثار کا مضمون "مریخ" چھپا اس میں انہوں نے مریخ کی انگلش (Murcury) لکھی ہے حالاں کہ مریخ کی انگلش (Mars) ہے۔ مرکری تو عطارد کو کہتے ہیں۔ ○ ..... توجہ دلانے کا شکریہ! محمد یونس حسین، کراچی۔ جولائی کا شمارہ بہت جلد مل گیا۔ آپ نے بلا عنوان کہانی کا سلسلہ کیوں ختم کر دیا ہے؟ مصباح فلک بلوچ، ڈیرہ غازی خان۔ آمنے سامنے بہت اچھا سلسلہ ہے۔ بنام آنکھ مچولی پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بچوں کو آنکھ مچولی سے پیار نہیں وہ صرف نام شائع کرانا چاہتے ہیں۔ عامر محمد توفیق خان، کوہاٹ۔ جولائی کا آنکھ مچولی مجھے اور میرے گھر والوں کو بے حد پسند آیا۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ سید مقداد مہدی، مخدوم آباد۔ اس بار "نٹ کھٹ کی ایک کہانی" "ریورس سوئنگ" اور "مزے دار گھونسلے" اچھی تحریریں تھیں۔ صائمہ یٰسین، کراچی۔ کلینڈر کا تحفہ پسند آیا۔ سرورق بھی اچھا تھا۔ نائلہ دلاور خان، کراچی۔ اس دفعہ لطائف اچھے تھے۔ "ریورس سوئنگ" پڑھ کر بہت سوں کی بدگمانی دور ہو گئی ہوگی۔ محمد عامر ذکریا، کراچی۔ اس بار کلینڈر کا تحفہ "دہائی" ہے۔ کہانیوں نے محفل سجائی ہے بصورت مجموعی جولائی کا آنکھ مچولی رس ملائی ہے۔ ○ ..... آپ کی شاعری مگر ہماری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ ثوبیہ گلزار، راولپنڈی۔ تازہ شمارہ ملا بہت پسند آیا مگر لطائف بور کر گئے۔ لطائف نہ ہی چھاپیں تو بہتر ہے۔ رفعت، عائشہ ..... اسلام آباد۔ جولائی کا آنکھ مچولی پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ پورا رسالہ جگ مگ جگ مگ کرتی تحریروں سے بھرا پڑا تھا۔ قلم دوست میں "اللہ یہاں ہے" بے حد پسند آئی۔ ہما شریف، کراچی۔ سرورق اچھا تھا..... کلینڈر کا تحفہ بھی پسند آیا۔ کہانیوں میں "تم تو لڑکی ہو" بہت پسند آئی۔ سلسلے وار کہانی "وہ کیا راز تھا" مزید حیرت انگیز ہو گئی ہے لیکن یہ بالکل تصوراتی کہانی ہے۔ خاص نمبر کا انتظار ہے جو ہمارے لئے ایک بہت بڑا تحفہ ہو گا ○ ..... بے فکر رہئے

..... ہم اس تحفے کے ساتھ بھی ایک عدد تحفہ اور دیں گے۔ شہزادہ فیصل، لاہور۔ جولائی کے خوبصورت شمارے کی تمام کہانیاں مثالی تھیں۔ صدف یوسف، کراچی۔ جولائی کا شمارہ ملا پڑھ کر بہت مزا آیا۔ "وہ کیا راز تھا" زبردست جارہی ہے۔ گل مینہ اسرار، پشاور۔ سبھی کہانیاں لاجواب تھیں ..... مجموعی طور پر رسالہ پسند آیا۔ جمشید احمد خان انصاری، کراچی۔ "نٹ کھٹ کی ایک کہانی" "آمنے سامنے" "ندامت" "سات بہنیں سات بھیڑیے" بہت پسند آئی۔ حنا احمد، راولپنڈی۔ اس دفعہ خلاف معمول جولائی کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ "اے بت میں تیرا پجاری نہیں" "ندامت" "تم تو لڑکی ہو" اور "نٹ کھٹ کی ایک کہانی" بہت پسند آئی۔ محمد آصف ذکریا، کراچی۔ آنکھ مچولی پڑھا اور اس بات سے متفق ہو گیا کہ آنکھ مچولی پاکستان کا نمبر ون "چلڈرنز میگزین" ہے۔ آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ شاہد الرحمن چوہدری، سرگودھا۔ "سنہرے حروف" اور "ماروں کی پہلی بات" حسب معمول بہت اچھے تھے۔ جنید احمد، راولپنڈی۔ اس دفعہ کا شمارہ لاجواب تھا۔ "نٹ کھٹ کی ایک کہانی" "ندامت" اور "سرحد کے اس پار" بہت پسند آئی۔ حنا اسرار، پشاور شہر۔ سرورق خوبصورت تھا۔ "وہ کیا راز تھا" "سات بہنیں اور سات بھیڑیے" بہت پسند آئیں۔ جویریہ احمد، راولپنڈی۔ انکل! میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔ آپ نے نہ تو کبھی میری تحریر شائع کی اور نہ میرا خط.....!! ○ ..... بھئی! آپ تحریریں ہی ایسی بھیجتی ہیں کہ ردی کی ٹوکری انہیں ہڑپ کر جاتی ہے۔ مزے دار اور دلچسپ تحریریں بھیجئے ناں!! الماس زریں، کراچی۔ اس شمارے میں مضامین بہت اچھے تھے۔ ان سے ہمارے علم میں اضافہ ہوا۔ خدیجہ پرویز، اسلام آباد۔ میں آنکھ مچولی بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ کیا آپ میری کہانی شائع کر دیں گے؟ ○ ..... بھئی! آپ ابھی اور محنت کریں اور خوب مطالعہ بھی۔ ارم خاتون، کراچی۔ محمد عادل منہاج کی کہانی "بغاوت" بے حد پسند آئی۔ محمد نواز بلوچ، گل حسن بلوچ، بلوچستان۔ بنام آنکھ مچولی میں اپنا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اصغر علی، جیکب آباد۔ پہلی بار آپ کی محفل میں شرکت کر رہا ہوں امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ شاہ اختر قریشی، اسلام آباد۔ قلم دوست میں عنبرین عشرت کی "مسٹر اے ڈی اور ڈی" نمبر لے گئی۔ آپ سب سے اچھی تحریر خواہ وہ کہانی ہو یا مضمون اس پر ایک اچھا سا انعام دیجئے!! صائمہ دلدار، جھمرہ سٹی۔ اس مرتبہ کہانیاں بہت کم تھیں اور معلومات بہت زیادہ ..... یہ کیا بات ہوئی بھلا!! محمد شاہد، حافظ آباد۔ مجھے بچوں کے ماہناموں میں آنکھ مچولی سب سے زیادہ پسند ہے۔ حمیرا صدیقی، کوئٹہ۔ آنکھ مچولی ایک تفریحی اور معلوماتی رسالہ ہے۔ میرا خط ضرور شائع کیجئے۔ ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا ○ ..... بھئی چیزوں کو ہم ٹوٹنے پھوٹنے نہیں دیتے۔ محمد ظفر اللہ ضیا، کمالیہ۔ پرانے مقابلے بند اور نئے مقابلے شروع کر کے آپ نے اچھا قدم اٹھایا ہے مگر آپ سے ایک زبردست شکایت ہے کہ آپ نے گھڑی اور کیلکولیٹر جیسے یادگار انعامات ختم کر کے تمام انعامی مقابلوں میں آنکھ مچولی کا شمارہ مخصوص کر دیا ہے۔ ○ ..... ایک ہی جیسے انعامات کب تک دیئے جاتے۔ محمد شکیل الرحمن خان، خوشاب۔ پہلی بار آنکھ مچولی پڑھا۔ اس کی کہانیاں اور نظمیں مجھے بے حد اچھی لگیں۔ ایک مزاحیہ خبر نامہ بھیج رہا ہوں۔ ○ ..... بھائی! خوش آمدید ..... آپ کے مزاحیہ خبر نامے کو پڑھ کر ہمارے آنسو بہنے لگے ہیں آپ کوئی دوسری مزے دار تحریر بھیجئے۔ عاصم محمود عثمانی (؟) مجھے آپ کا رسالہ بے حد پسند ہے اور میں اسے کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ اورنگ زیب لغاری، ٹنڈو محمد خان۔ اس دفعہ کا سرورق اچھا تھا کہانیاں بھی پسند آئیں۔ راشد ارشد، لاہور۔ آنکھ مچولی ہمیں بہت پسند ہے کیوں کہ اس میں بہت ساری کہانیاں، نظمیں اور معلومات کی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔

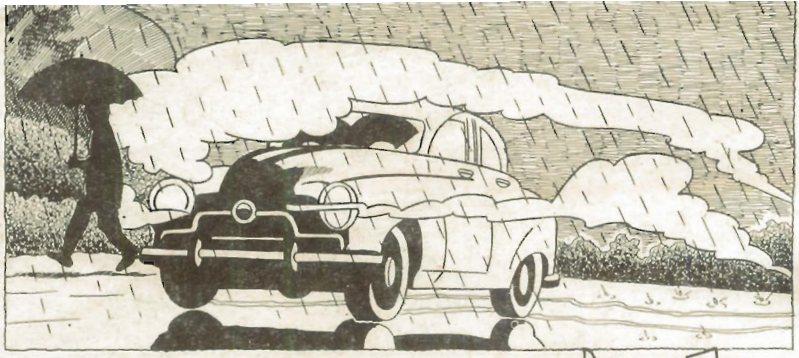

بارش کب، کیسے، کہاں اور کتنی

نگہت آرا چوہان

جب بھی آپ آسمان پر بڑے اور گہرے بادل دیکھتے ہیں تو فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ بارش ہونے والی ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ بارش کے لئے بس بادل ہی کافی ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں بارش ہونے کا عمل کافی لمبے اور پیچیدہ مراحل طے کرتا ہے۔ دھوپ، زمین اور فضا مل جُل کر بارش تیار کرتے ہیں۔ یہ عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب زمین دھوپ سے گرم ہوتی ہے۔ اس گرمی سے زمین پر موجود سمندروں، جھیلوں، چشموں اور گیلی زمین پر بھاپ بننی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ پانی ملی بھاپ پھر ہوا میں شامل ہو جاتی ہے۔ اسے عملِ تبخیر کہتے ہیں۔

اب گرم ہوا ان بخارات کو اوپر فضا میں لے جاتی ہے جہاں یہ پھیل کر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ اس عمل کے دوران گرم ہوا اپنا بوجھ نہ نظر آنے والے بخارات کی شکل میں خارج کرتی ہے اور یہ بادل بن جاتے ہیں۔ اسے عملِ تکثیف کہتے ہیں۔ بادل کے اندر جیسے جیسے ننھے قطرے میں نمی بڑھتی جاتی ہے یہ بڑا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ ہوا اس کا وزن نہیں سہار سکتی۔ چنانچہ یہ بارش کی صورت میں زمین پر گر پڑتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ بارش خاص اوقات ہی میں کیوں ہوتی ہے۔ سب سے پہلے عملِ تبخیر دن کے وقت شروع ہوتا ہے۔ آبی بخارات فضا میں بلند ہوتے رہتے ہیں لیکن نادیدہ آبی بخارات ہر روز بادلوں میں تبدیل نہیں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آبی بخارات کو کثیف ہونے کے لئے ایک سطح درکار ہوتی ہے۔ اگر یہ بہت تھوڑے ہوں اور ہوا میں غبار نہ ہو تو عملِ تکثیف نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ فضا میں برف کے ذرات بھی قطرہ بننے میں مدد دیتے ہیں۔

عام طور جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ گرم ہوا کی سرد ہوا کے مخالف حرکت ہے۔ گرم ہوا میں بادل اور نمی ہوتی ہے اور جب یہ ٹھنڈی ہوا میں ملتے ہیں تو پانی کے قطرے بنتے ہیں اور بارش برستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موسمی پیشن گوئیوں میں ہمیشہ ہوا کی حرکت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس سے ہم یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ بارش ہوگی یا نہیں۔ بہت سی باتوں سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ دنیا کے کس علاقے میں کتنی بارش یا برف باری ہوگی۔ اس میں درجہ حرارت، سطح سمندر سے بلندی، پہاڑوں کا محل وقوع وغیرہ شامل ہیں۔

دنیا میں سب سے زیادہ بارش ماؤنٹ ولیالی میں ہوتی ہے جو جزائر ہوائی کے علاقے کوائی میں واقع ہے۔ یہاں اوسطاً ۱،۱۹۷ سینٹی میٹر سالانہ بارش ہوتی ہے۔

دوسرے نمبر پر بھارت سب سے زیادہ بارش والا علاقہ ہے جہاں ۱،۰۷۹ سے لے کر ۱،۱۴۳ سالانہ کی اوسط ہے۔ ایک بار چرا پونجی کے مقام پر پانچ دن کے دوران ۳۸۱ سینٹی میٹر بارش ہوئی اور ۱۸۶۱ میں یہاں بارش کا اوسط ۲،۳۰۰ سینٹی میٹر تک جا پہنچا۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کتنی بارش ہوتی ہے چند شہروں میں بارش کی اوسط دیکھئے۔ لندن میں سالانہ ۶۱ سینٹی میٹر، ایڈن برگ میں ۶۸ اور کارڈف میں ۷۶ سینٹی میٹر، نیویارک میں سالانہ ۱۰۱ سینٹی میٹر، کینیڈا اوٹاوہ میں ۸۶، میڈرڈ میں ۴۳ اور پیرس میں ۵۵ سینٹی میٹر اور ان میں کتنا فرق ہے۔

سب سے زیادہ خشک مقام چلی میں اریکا ہے یہاں صرف ۰،۰۵ سینٹی میٹر سالانہ بارش ہوتی ہے۔ امریکہ میں سب سے خشک علاقہ ڈیتھ ویلی گرین لینڈ لانچ ہے جہاں ۳،۷۵ سالانہ کی اوسط ہے۔

بعض علاقوں میں پورے سال زبردست بارش ہوتی ہے۔ تقریباً ہر جگہ ۱۵۲ سینٹی میٹر یا اس کے مساوی بارش ہوتی ہے۔ خطِ استوا ہوا کے دو بڑے علاقوں کے اتصال کا مقام ہے۔ خط استوا پر ہوا شمال سے جنوب کے مقام پر ملتی ہے۔ یہاں گرم ہوا آبی بخارات کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھتی ہے۔ جیسے جیسے ہوا بلند ہو کر ٹھنڈے مقامات پر پہنچتی ہے۔ بہت زیادہ آبی بخارات کثیف ہوتے ہیں اور پھر بارش کی صورت میں برس پڑتے ہیں۔

بارش پہاڑوں کے ہوا والے علاقوں میں زیادہ برستی ہے۔ دوسرے علاقوں میں کم بارش ہوتی ہے۔ اس کی مثال کیلیفورنیا میں کسیڈرینج کا علاقہ ہے۔ یہاں مغربی ہوا آبی بخارات لے کر بحرالکاہل سے اٹھتی ہے۔ ساحل سے ٹکرانے کے بعد مغربی پہاڑیوں کی ڈھلان سے ٹھنڈی ہوا اسے ٹھنڈا کر دیتی ہے ٹھنڈ سے آبی بخارات کثیف ہو جاتے ہیں اور بارش یا برف کی صورت میں گر پڑتے ہیں۔

میں اس کی یہ میری بہنا

محمد جاوید خالد

عُظمیٰ لُبنیٰ بہنیں ہیں دو — اک دن دیکھا لڑتے ان کو
دونوں کے بگڑے تھے تیور — بول رہی تھیں وہ بڑھ بڑھ کر
حال یہ ان کا میں نے پایا — تو دونوں کو یوں سمجھایا
"لڑنا جھگڑنا بات بُری ہے — پیار پہ چلتی اس سے چھری ہے"
پر ان کو غصّہ تھا زیادہ — ان کا یہ لگتا تھا اِرادہ
یوں ہی لڑتی رہیں گی دونوں — اور بگڑتی رہیں گی دونوں

..... ○ ..... ○ ..... — ..... ○ ..... ○ .....

پھر اِک دن یہ میں نے دیکھا — لُبنیٰ کا تو حال بُرا تھا
چوٹ لگی تھی اس کو ایسی — کھانا پینا بھول گئی تھی
عُظمیٰ تھی اس کی ہمجولی — بول رہی تھی پیار کی بولی
پیار کا اس کے دم بھرتی تھی — اور اس کی خدمت کرتی تھی
حیرت سے یوں میں نے پوچھا — "یہ تبدیلی کیسی عُظمیٰ؟"
تم لُبنیٰ سے بہت بدظن تھیں — تم آپس میں تو دشمن تھیں
عظمیٰ کہنے لگی۔ کہ کیا ہے؟ — بہن کا میری حال بُرا ہے
میں اس کے کیوں کام نہ آؤں — میں تو اس کے واری جاؤں
پیار کو جھگڑے کم نہ کریں گے — ہم آپس میں ایک رہیں گے
میں اس کی یہ میری بہنا — ہم کو ہے مِل جُل کر رہنا

سب کا بادشاہ

عنبرین فاطمہ چوہان

دلّی کا بادشاہ جنگل میں تنہا گھوڑا دوڑا رہا تھا تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہرن کے تعاقب میں وہ اپنے ساتھیوں سے بہت دور آنکلا تھا۔ کئی میل تک گھوڑے نے برق رفتار ہرن کا تعاقب کیا۔ لیکن آخر کار گھنی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ سخت گرمی کا زمانہ تھا..... پھر دوپہر کا وقت۔ گرم ہوا سے جسم جھلس رہا تھا۔ پیاس کی شدّت سے ہونٹ خشک تھے اور حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے

شاہجہاں نے گھوڑا روک کر جسم سے پسینہ پونچھا اور سوچنے لگا کہ اب پانی کی تلاش میں کدھر جائے؟ گھوڑا بھی گرمی کی شدّت سے ہانپ رہا تھا۔ آخر شاہجہاں نے پیاس سے بے تاب ہو کر ایک طرف کو گھوڑا ڈال دیا۔

کئی میل چلنے کے بعد بھی کسی بستی کے آثار نظر نہ آئے ــــ البتہ بہت دور کچھ سائے چرتے ہوئے نظر آئے اور بانسری کی مدھ بھری آواز بھی تیز

منچلا بڑی درد ناک آواز میں بانسری بجا رہا تھا۔ بادشاہ نے گھوڑا روکا کچھ فاصلے پر دیکھا کہ ایک نوجوان شکستہ اور میلے کپڑے پہنے ایک درخت کے نیچے بڑی بےنیازی کے ساتھ ریت پر نیم دراز ہے اور دنیا کی ہر فکر سے آزاد بڑی مستی کے ساتھ بانسری بجا رہا ہے۔ بادشاہ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ "کیا اس جنگل کا بادشاہ یہی شکستہ حال نوجوان ہے؟" شاہ جہاں نے سوچا۔ نوجوان بانسری بجانے میں مگن تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ایک نظر دیکھا۔ "ہونہہ، کوئی شکاری ہو گا۔" دل ہی میں سوچا اور بانسری بجانے میں لگ گیا۔ بادشاہ اس کے قریب پہنچا اور پوچھا۔

"میاں صاحبزادے! یہاں کہیں پینے کے لئے پانی بھی مل جائے گا۔" شاہجہاں کا شاہانہ لباس اور شاندار گھوڑا دیکھ کر چرواہا ذرا چونکا مگر جلد ہی سنبھلا اور بولا، "یہاں پانی کہاں، پانی تو بستی میں ملے گا۔ تھوڑی ہی دور بستی ہے۔" ہاتھ کے اشارے سے چرواہے نے رہنمائی کی اور پھر خود ہی اسے بستی میں لے گیا اور ٹھنڈا پانی پلایا۔

پانی پینے کے بعد بادشاہ نے اس نوجوان سے کہا "تم نے ہمارا جی خوش کر دیا۔ کوئی خواہش ہو تو بتاؤ؟"

"میری خواہش ہے کہ بادشاہ کو قریب سے ہمارے بادشاہ!" حیرت سے چرواہا بادشاہ کو دیکھتا رہ گیا — اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ واقعی شاہجہاں کو دیکھ رہا ہے — ایک چرواہا اپنے بادشاہ سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے اپنی قسمت پر رشک آرہا تھا آج بادشاہ اس کا مہمان تھا، مگر وہ ڈر رہا تھا کہ اس نے بادشاہ کو بڑی بے رخی سے جواب دیا تھا۔ وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

بادشاہ نے اس کا سکوت توڑتے ہوئے کہا، "تم ہمارے پاس آنا ہم تمہیں انعام دیں گے۔ دیکھو پیڑ کی چھال اٹھالاؤ۔" اور بادشاہ نے پیڑ کی چھال پر کوئلے سے کچھ لکھ کر اس کو دیا۔ "تم یہ لے کر لال قلعہ میں آنا میں تمہارا انتظار کروں گا۔" اور یہ کہہ کر شاہجہاں وہاں سے لوٹ گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ شاہجہاں اپنے میزبان کا بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا "میں اپنے میزبان کو انعام دے کر مالا مال کر دوں گا۔"

جمعہ کا دن تھا۔ بادشاہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے جامع مسجد جا چکا تھا۔ لال قلعہ میں کئی روز سے چرواہے کا انتظار تھا۔ آج دوپہر کے وقت چرواہا قلعہ کے پھاٹک پر پیڑ کی چھال لئے پہنچا تو قلعہ کے محافظوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اسی وقت دو سپاہیوں کے ساتھ شاہجہاں کی خدمت میں جامع

موجود تھے۔ سپاہی چرواہے کو کچھ درباریوں کے حوالے کر کے واپس ہو گئے۔ چرواہے نے پوچھا "بادشاہ کہاں ہے؟" بتایا گیا کہ "وہ رہا بادشاہ۔" چرواہے نے دیکھا بادشاہ ہاتھ پھیلائے گڑگڑا کر دُعا مانگ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر چرواہا واپس جانے لگا۔ درباریوں نے اسے روکا لیکن وہ رُکا نہیں۔ بادشاہ کو پتہ چلا تو اس نے اسی وقت کچھ لوگوں کو گھوڑوں پر دوڑا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ نوجوان کو لے کر واپس آ گئے ـــ بادشاہ نے انتہائی عزت کے ساتھ اس نوجوان کو اپنے پاس بٹھایا۔ دیر تک اس کی خاطر تواضع کرتے رہے۔ لیکن چرواہا جیسے ہر عزت و اکرام سے بے نیاز تھا۔

شاہجہاں نے اس سے پوچھا۔

"تم ہم سے ملنے آئے تھے اور پھر ملے بغیر ہی واپس ہو گئے۔ آخر کیوں؟" وہ خاموش رہا۔

شاہجہاں نے دوبارہ اسے متوجہ کیا۔ "ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے اور تم ملے بغیر ہی واپس جا رہے تھے۔ بتاؤ تو سہی آخر بات کیا ہوئی؟"

"میں آپ سے انعام لینے آیا تھا مگر میں نے دیکھا کہ آپ خود ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگ رہے تھے، جب آپ خود مانگ رہے تھے تو بھلا مجھے کیا دیتے، میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں بھی اسی سے مانگوں۔ جس سے آپ مانگ رہے تھے۔ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔" چرواہے نے بڑی سادگی اور جرآت سے کہا۔

شاہجہاں لاجواب ہو کر اس کا منہ تکتا رہا گیا۔ اور چرواہا شاہجہاں کے پاس سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

تک نیم مردہ حالت میں زندہ رہ سکتا ہے اگر اسے پھر بھی پانی مل جائے تو وہ زندہ ہو جاتا ہے۔

چاکلیٹ تتلی

جنوبی امریکہ کے ملک برازیل میں ایک عجیب و غریب تتلی پائی جاتی ہے۔ یہ تتلی دیکھنے میں خوبصورت ہوتی ہے اس کا رنگ چاکلیٹی ہوتا ہے خوبی یہ ہے کہ تتلی میں سے چاکلیٹ کی خوشبو آتی ہے۔

مگرمچھ کا بچہ

مگرمچھ کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی بڑی پھرتی سے پانی میں کود پڑتا ہے اور اپنی زندگی کے پہلے گھنٹے کے اندر ہی شکار پر حملہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

مرسلہ ...... یاسر بن نثار۔ راولپنڈی

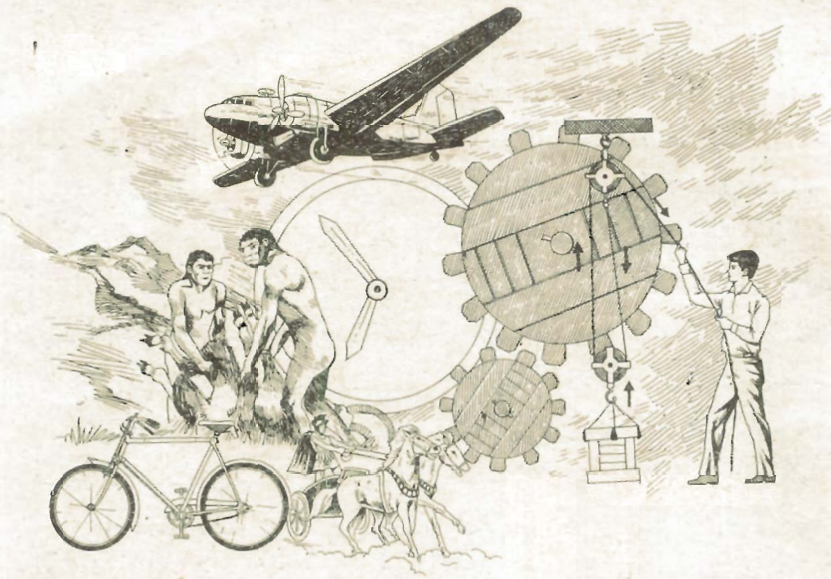

پہیہ

ایجادات کی ماں

عبدالستار خان

فرض کیجئے وقت پیچھے کی طرف سینما سلائیڈ کی طرح دوڑنے لگے اور ہم اس مشینی تہذیب سے پیچھے بہت پیچھے یعنی ۴۰۰۰ قبل مسیح میں پہنچ جائیں تو ہمارا کیا حال ہوگا؟ یہی نا کہ زندگی کی جتنی سہولتیں آج ہمیں میسّر ہیں، ان میں سے ایک سہولت بھی ہمیں حاصل نہ ہوگی اور ہم اپنے آپ کو بالکل بے بس پائیں گے۔ خوراک، لباس اور رہائش کے لئے ہم بے شمار مشکلات کا سامنا کریں گے اور ہمارے ہاتھ پاؤں کے سوا کوئی چیز بھی ہماری مدد کو آگے نہ بڑھے گی۔ مثلاً خوراک حاصل کرنے کے لئے جنگل میں ہم کوئی بڑا سا جانور شکار کریں گے تو پہلا مسئلہ یہ سامنے آئے گا کہ اس جانور کو کسی نہ کسی

طرح اس مقام تک پہنچایا جائے، جہاں ہم رہتے ہیں۔ اتنے بڑے جانور کو گھسیٹ کر لانا اور وہ بھی جنگل میں اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اس لئے ہمارا دماغ فوراً سوچے گا کہ اس کے نیچے چند شاخیں یا چپٹی لکڑی کے تختے رکھنا چاہیں۔ اس طرح ہم سادہ سی سلیج گاڑی بنالیں گے جس کے ذریعے اتنے بڑے جانور کو گھسیٹنا آسان ہو جائے گا اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے خشکی پر نقل و حمل کے لئے پہلی گاڑی ایجاد کر لی ہے۔

فرض کیا اگر ہم پندرہ بیس ہزار سال پہلے پتھر کے اس قدیم زمانے میں ہوتے تو صرف تجربہ ہی ہمیں سکھاتا کہ بھاری بوجھ کو زمین پر گھسیٹنے کی بجائے اس کے نیچے تختے یا گول شاخیں رکھ کر گھسیٹنا آسان ہے۔ کیونکہ فزکس نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ نقل و حمل کے لئے بڑی رکاوٹ رگڑ ہے۔ یہ جتنی زیادہ ہوگی جسم کو گھسیٹنا اتنا ہی مشکل ہوگا۔ رگڑ ایک چیز کے دوسری چیز سے ٹکر کھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان دو چیزوں کی سطح جتنی کھردری ہوگی۔ رگڑ اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اصل میں کائنات میں کوئی چیز بھی اتنی ملائم نہیں کہ اس میں رگڑ نہ ہو، اس لئے ہر چیز دوسری سے ٹکرا کر تھوڑی بہت رگڑ پیدا کرتی ہے۔ تاہم بعض چیزیں دوسری چیزوں کی نسبت کم رگڑ پیدا کرتی ہیں لیکن یہ سب اصول اس پتھر کے زمانے کے جاہل لوگ کیونکر جانتے۔ البتہ ضرور ہے کہ جب عہدِ قدیم کے انسان نے اپنے بھاری بھر کم شکار کے گداز جسم کے نیچے گول شاخیں یا چپٹے ٹکڑے رکھ کر گھسیٹا تو اس نے اس کے گھسیٹنے میں آسانی محسوس کی۔ یہی سہولت اس نے اس وقت محسوس کی جب اس کو مکان کی تعمیر کے لئے دور دراز سے بڑے بڑے پتھر اٹھا کر لانا پڑے۔ پھر جب اس قدیم زمانے کے انسان نے کھیتی باڑی شروع کی تو "تختہ گاڑی" اور زیادہ کار آمد ثابت ہوئی۔ حضرتِ انسان نے دو تختوں کو برابر برابر رکھ کر اور ان کے اوپر ایک افقی ڈنڈا اگا کر اپنی ایجاد کو چمڑے کے تسموں یا رسیوں سے کس کر ٹھیک کر لیا۔ سردی کے موسم میں یہ تختہ گاڑی اور بھی زیادہ کار آمد ثابت ہوئی۔ وہ اس لئے کہ برف کی سطح بہت ہی پھسلوان ہوتی ہے۔ خاص کر جب برف کسی دریا یا جھیل پر جم کر آئینے کی طرح شفاف اور ہموار ہو جائے۔ پھر "تختہ گاڑی" کے چند ہزار سال بعد حضرتِ انسان کی عقل نے ایک اور کمال کر دکھایا اور ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا، جس کی وجہ سے نقل و حمل کا موجودہ نظام قائم ہے۔ یہ انقلاب آفرین ایجاد "پہیہ" تھی۔

پہیہ کب ایجاد ہوا؟ کہاں اور کس شکل میں ایجاد ہوا؟ ان تمام باتوں کے جوابات ہمیں کسی بھی تاریخ کی کتاب میں نہیں ملتے لیکن پہیہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اگر پہیہ ایجاد نہ ہوتا تو نہ کوئی جہاز اڑتا، نہ کسی فیکٹری میں کام ہوتا، نہ کوئی گھڑی وقت بتاتی اور نہ ہی انسان اتنی زیادہ ترقی کر سکتا۔ پہیہ کی ایجاد کے بارے میں ہم اس قسم کی

رائے قائم کر سکتے ہیں کہ شاید کوئی بیلن گھس گھس کر باریک رکابی یا قرص کی شکل کا بن گیا ہو اور اس سے کسی پرانے ذہین آدمی کو پہیہ کا تصور ملا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیلن میں کوئی لکڑی پھنس گئی ہو اور دھرے کی شکل بن گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ عہد قدیم کے کسی نابغہ (جینیس) نے جو مشینی رجحان رکھتا ہو، متعدد تجربات کے بعد پہیہ بنایا ہو۔ قصہ مختصر کہ پہیہ ایجاد ہوا اور ہر جگہ اور ہر ملک میں رواج پانے لگا۔ مدتوں تک اس کی شکل بے ڈھنگی سی رہی ہوگی۔ درخت کے تنے میں سے کسی نے بے ڈھنگا سا قرص تراشا ہوگا۔ لیکن یہ کام چاقو آری یا رندے کے بغیر ممکن نہیں۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ غالباً پہیہ کی ایجاد دھات کے دور کے بعد ہوئی ہوگی۔ کیونکہ بھدے اوزاروں سے کٹائی اور چھلائی ممکن نہ تھی۔

آثار قدیمہ کے بعض ماہرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کی سرحدوں پر "کوہِ الپس" کی جھیلوں کے باشندے بیس ہزار سال پہلے پہیہ دار گاڑیاں استعمال کرتے تھے لیکن اس دعویٰ کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ قابلِ اعتماد شہادت سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ پہیہ دار گاڑیاں پہلے پہل ۴۰۰۰ ق م اور ۳۵۰۰ ق م کے درمیان ملک شام اور سمیریا میں استعمال ہوئیں۔ ۳۰۰۰ ق م کے قریب میسوپوٹیمیا (جس کو ہم آج کل عراق کہتے ہیں) میں ان کا رواج عروج پر تھا۔ ۲۵۰۰ ق م میں یہ پہیہ دار گاڑیاں سندھ میں رائج ہوئیں۔ ان گاڑیوں کے چند نمونے ہڑپہ کے کھنڈرات میں بھی دریافت ہوئے ہیں۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ مصر میں پہیہ کا رواج مدتوں بعد ہوا لیکن رائج ہوتے ہی پہیہ میں بڑی بڑی اصلاحیں بھی اسی ملک میں ہوئیں۔ مصریوں نے ہی ۱۸۰۰ ق م کے قریب ٹھوس پہیہ کی بجائے اس کے دھرے میں ڈانڈیں لگائیں جس سے کم وزن اور ٹھوس پہیہ وجود میں آیا۔ ورنہ ٹھوس چوبی قرص زیادہ بوجھ کے نیچے بہت جلد ٹوٹ جاتی تھی۔ پہیہ کے دھرے اور دائرے کو ڈانڈوں کے ذریعے جوڑنے سے بوجھ کا دباؤ برابر برابر تقسیم ہو جاتا تھا۔ مصریوں نے ہی گاڑی کے بھدے تختوں کی جگہ بکس یا ڈبے کی شکل کا فریم بنایا جس سے گاڑی کی صحیح شکل وجود میں آئی۔

اہل یونان اور اہلِ روم نے مصریوں کی اس پہیہ گاڑی کی نقل کر کے رتھ ایجاد کی۔ پہلے پہل اس کو کھینچنے کے لئے بیلوں کو سدھا کر استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں گھوڑے استعمال ہونے لگے۔ اس کو دو یا چار گھوڑوں کی مدد سے کھینچا جاتا تھا۔ یہ جنگوں میں لڑائی کے لئے بھی استعمال ہوتی تھی۔ اس کے بعد رومیوں نے چار پہیوں والی بگھی تیار کی جس کا اگلا دھرا افقی حرکت کرتا تھا اس سے بگھی کو موڑنا بہت آسان ہو گیا۔ اسی اصلاح کی بدولت یہ گاڑی یا بگھی اتنی مقبول ہوئی کہ ساری دنیا میں اس سے نقل و حمل کا کام لیا جانے لگا۔ اور یوں پہیہ کی ایجاد سے سینکڑوں کام آسان ہو گئے۔

وہ کیا راز تھا؟

آٹھویں قسط

محمد عمر احمد خان

چیخ کی آواز نے جواد کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ اس کے بھائی کی چیخ تھی جو ایک کالی مکڑی سے ڈر گیا تھا۔ پھر چھوٹے بھائی کی ہاتھوں میں دستانے دیکھ کر جواد خوفزدہ ہو گیا۔ اس خوف کا محرک وہ واقعہ تھا جو دارلحکومت میں ایک سال پہلے اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ ٹرین میں اس کے ہم سفر شیر بہادر صاحب پُراسرار شخصیت ثابت ہوئے جنھوں نے پہلے تو ٹکٹ نمبر تبدیل کر دیا اور پھر دارلحکومت میں ٹھہرنے کے لئے "ہوٹل اسپا" کا کارڈ دیا جو بعد میں "ہوٹل اسپائیڈر" نکلا۔

جواد نے ہوٹل فون کیا تو ایک مختصر وقت میں آٹھ پہیوں والی ایک عجیب و غریب گاڑی اسے لینے اسٹیشن پہنچ گئی۔ گاڑی کے میزبان اور ڈرائیور نے شیر بہادر صاحب کی طرح آنکھوں پر کالا چشمہ لگایا ہوا تھا اور ہاتھ دستانوں میں پوشیدہ تھے۔

ہوٹل کے منیجر نے چابی جواد کو دی تو نیچے گر گئی۔ ملازم نے اُٹھا کر جواد کی طرف بڑھائی تو جواد حیرت زدہ رہ گیا۔ ملازم کے ہاتھوں میں آٹھ اُنگلیاں تھیں۔

اس پورے ہوٹل میں آٹھ کا ہندسہ گردش کر رہا تھا۔ پھر پُراسرار واقعات کا سلسلہ چل پڑا تو بڑی تیزی کے ساتھ ڈرامائی واقعات پیش...... آنے لگے۔ خونی مکڑیاں سفید سفوف کھا کر بڑی بڑی عفریتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ انہوں نے دیکھے

ہی دیکھتے ملازم کو چیر پھاڑ ڈالا۔

منیجر اور ہوٹل کے ملازمین نے عجیب و غریب گنوں سے مکڑیوں پر فائرنگ کی تو مکڑیاں ہلاک ہو گئیں لیکن سفید سفوف کھانے کی وجہ سے وہ دوبارہ زندہ ہو گئیں اور اس بار انہوں نے منیجر، ملازمین اور جواد کو مار ڈالا۔

خونی مکڑیاں اُڑنے والے عجیب و غریب پرندوں کے پیچھے باغ میں چلی گئیں تو راہداری میں سناٹا بولنے لگا...... پھر نصف گھنٹہ گزر گیا تو ایک نہایت ہی حیرت انگیز بات رونما ہوئی۔ تمام لاشیں زندہ ہو گئیں...... ۔ ایک لاش نے غرا کر کہا۔ ”ہمیں کوئی نہیں مار سکتا ہم نے سفید سفوف کھایا ہے......!! “ مر کر زندہ ہونے والوں نے ” آبِ حیات “ سے غسل کیا تو سب کے زخم بھر گئے۔

دوبارہ زندہ ہونے کے بعد جواد کا قد بے انتہا لمبا ہو گیا۔ ہوٹل کے تمام لوگ اس کے سامنے بونے لگ رہے تھے۔ در حقیقت وہ کوہ قاف کی بونوں کی ایک اعلیٰ نسل سے تھے اور نہایت ذہین تھے، سفید سفوف کھا کر وہ بڑے ہوئے تھے۔ جواد کی آنکھیں پرندوں کی طرح گول ہو گئی تھیں اور جب وہ کسی کی طرف نگاہ بھر کر دیکھتا تھا تو اس کی سوچ کی لہریں سامنے والے شخص کے دماغ کو کریدنے لگتی تھیں اور جواد کو پتہ چل جاتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے؟ ...... یہ ٹیلی پیتھی کی صلاحیت تھی جو حیرت انگیز طور پر اسے حاصل ہو گئی تھی۔ آڈیٹوریم میں دنیا بھر کے ذہین سائنس دان موجود تھے۔ وہ مر چکے تھے لیکن در حقیقت اپنی طبعی موت نہیں مرے تھے ان ذہین سائنس دانوں کو قبروں سے حاصل کیا گیا تھا۔ آٹھ انگلیاں والے ان سائنس دانوں کے تجربات کے ذریعے پوری دنیا پر اپنا کنٹرول حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ پرندوں اور مکڑیوں کو وہ اپنے تجربات میں استعمال کر رہے تھے اور ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔

کچھ ہی دیر بعد اعلان ہونے لگا کہ ”ہماری نئی مملکت کے سربراہ تشریف لا رہے ہیں۔ “ تھوڑی ہی دیر بعد آٹھ ہاتھ پیروں والا ایک عجیب و غریب بونا ڈائس پر نمودار ہوا تو تمام لوگ اس کی تعظیم کے لئے جھک گئے لیکن جواد اپنی جگہ ہی کھڑا رہا۔ ”تم نہیں جھکے.... آخر کیوں؟ “ بونا غصے سے دھاڑا پھر اس کی آنکھیں سے جیسے بجلیاں سی کوندیں۔ جواد ان بجلیوں کے زیرِ اثر بڑی تیزی کے ساتھ پیچھے گرنے لگا۔ شعاعوں کی قوت سے دیوار ٹوٹ گئی اور جواد ہوٹل کے باغ میں جا گرا جہاں خونی مکڑیاں پرندوں کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھیں۔ انہوں نے جواد کو دیکھا تو اس پر حملہ کر دیا...... اسی وقت جواد زمین میں دھنسنے لگا. مکڑیاں بھی اس کے ساتھ ہی دھنس رہی تھیں۔ پھر...... ایک زور دار دھماکہ ہوا تو جواد کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ اپنے بستر پر موجود تھا۔ ”اُف میرے خدایا! کتنا بھیانک خواب تھا!! “ خوف سے جواد نے اپنا سر پکڑ لیا۔ پھر کر کر کی آوازوں نے اسے متوجہ کیا تو خوف کے عالم میں وہ چلا اُٹھا۔ اس کے بستر پر واقعی ایک درجن کے قریب کالی کالی بدہیت مکڑیاں رینگ رہی تھیں۔ جواد نے تکیہ پھینک کر کچھ مکڑیاں مار دیں تو ہوٹل کا ملازم ناراض ہونے لگا۔ ”یہ آپ نے اچھا نہیں کیا؟ “ اس کا لہجہ غصیلا تھا اور اس میں جیسے وارننگ پوشیدہ تھی۔

جواد نے کمرے کی کھڑکی کو بند کرنا چاہا تو اس کی نظریں باہر پڑیں اور پھر باہر کا منظر دیکھ کر اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ وہی باغ تھا جو اس نے کچھ ہی دیر پہلے خواب میں دیکھا تھا!!

(اب آپ آگے پڑھئے)

اک دم سے جواد خوفزدہ ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر اس نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ سرد موسم ہونے کے باوجود پسینے کے ننھے ننھے قطرے اس کے چہرے پر اُبھر آئے اور ہمارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔

"تو اب تک جو کچھ میں نے دیکھا کیا وہ خواب نہیں تھا؟" گھبرا کر جواد نے سوچا۔

کچھ دیر تک وہ شش و پنج کی کیفیت میں ڈوبا رہا پھر ڈرتے ڈرتے اس نے دوبارہ کھڑکی کا پٹ کھولا اور باغ میں جھانکنے لگا۔ اس بار تفصیل سے اس نے باغ کا جائزہ لیا..... یہ سو فیصدی وہی باغ تھا جس میں اسے بونے نے پھینکا تھا اور خونی مکڑیاں اس سے چمٹ گئی تھیں۔ مکڑیوں کا خیال آتے ہی جواد کو جھرجھری سی آ گئی۔ پھر سرد ہوا کے جھونکے بھی کھڑکی سے اندر آنے لگے تو اک دم سے جواد کو خیال آیا کہ کچھ ہی دیر بعد اس کا انٹرویو شروع ہونے والا ہے جس کی غرض سے وہ اسلام آباد آیا ہے۔

اُلجھے ہوئے خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک کر جواد نے جلدی جلدی کپڑوں پر استری کی اور پھر نہانے چلا گیا۔ نہاتے ہوئے بھی اس کا ذہن ہزاروں خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اسے یقین سا ہونے لگا تھا کہ جو کچھ واقعات اس کے ساتھ پیش آئے..... وہ "خواب" کا حصہ نہیں تھے۔ خواب کا اسرار اب کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ "اس اسرار کو ہوٹل اسپائیڈر میں ہی رہ کر کھولا جا سکتا ہے۔" جواد نے نہاتے ہوئے سوچا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد جواد جلدی جلدی تیار ہوا۔ وہ ابھی آئینے میں اپنے بال بنا ہی رہا تھا کہ اسے گھرر گھرر کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ جواد کمرے کا دروازہ کھول کر راہداری میں نکل آیا۔ آوازیں ہوٹل کے عقبی حصے کی طرف سے آ رہی تھیں۔ جواد تیز تیز قدموں سے راہداری کی اس حصے کی طرف چلنے لگا۔ اس وقت وہ اپنے انٹرویو کے پروگرام کو بالکل بھول چکا تھا۔ عقبی حصے کی راہداری میں بڑے بڑے پردے لٹک رہے تھے جواد نے نوٹ کیا کہ ہر پردے میں آٹھ آٹھ شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔

جواد راہداری کے عین درمیان پہنچا ہی تھا کہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ راہداری کی بالکونی جو دو منزلہ ہو گی، اس سے نچلا منظر صاف دیکھائی دے رہا تھا۔ وہاں عقبی حصے میں ایک بل کھاتی ہوئی سڑک پر بڑے بڑے آٹھ پہیوں والے کچھ ٹرک کھڑے نظر آ رہے تھے۔ جواد نے انہیں گنا، وہ تعداد میں آٹھ تھے۔ ہوٹل کے ملازمین کی ایک کثیر تعداد ٹرکوں کے پاس کھڑی تھی۔ جواد ستون کی آڑ سے اس عجیب و غریب مخلوق کو دیکھنے لگا جو ٹرکوں سے نیچے اتر رہی تھی۔ ان کا قد بمشکل ڈھائی تین فٹ کے قریب ہو گا۔ چپٹی ناکوں والے وہ عجیب و غریب بونے تھے۔ جو سینکڑوں کی تعداد میں ہوں گے۔ جواد کو یاد آیا کہ خواب میں اس نے جس

بونے کو دیکھا تھا وہ انہی کی شکلوں سے ملتا جلتا تھا۔ جواد کی دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس نے دیکھا ٹرکوں سے اُترنے والے بونے ملازمین کی رہنمائی میں سفید رنگ کی ایک بڑی سی عمارت میں جا رہے ہیں جو ہوٹل کے پچھلے حصے میں ایک طرف واقع تھی۔ "یقیناً یہ لیبارٹری ہوگی!!" جواد نے سوچا اسی وقت راہداری میں قدموں کی چاپ سُنائی دی تو جواد چونک اُٹھا..... پھر بڑی تیزی کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو راہداری میں لٹکے ایک پردے میں چھپالیا۔ وہ ہوٹل کے ملازم تھے جو تعداد میں دو تھے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے پھر وہ اسی جگہ آکر کھڑے ہو گئے جہاں کچھ دیر پہلے جواد کھڑا تھا۔ "یار! یہ مشروب واقعی بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ اسے پی لو تو یوں لگتا ہے جیسے ہم ہوا میں اُڑ رہے ہوں۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" دونوں ملازم باتیں کرتے ہوئے بالکونی سے نیچے جھانکنے لگے۔ ان کی ساری توجہ نیچے ہی مرکوز تھی۔ وہ جواد کی وہاں موجودگی سے بالکل بے خبر تھے۔

"کتنا مزا آئے گا جب ساری دنیا پر ہماری حکومت ہوگی۔" ایک نے کہا۔

"کیا وہ وقت قریب ہے جب ہماری قوم دنیا پر قبضہ کر لے گی؟" دوسرے نے پوچھا۔ پہلے نے کہا۔ "ہاں..... لیکن اس میں تھوڑا وقت لگے گا ابھی تو ہم انہیں تھوڑی تھوڑی تعداد میں کھینچنے والی شعاعوں کی مدد سے باہر نکال رہے ہیں..... کیا کریں..... رات بھر میں دیواریں اتنی موٹی ہو جاتی ہیں کہ اس وقت ہماری ایجاد کردہ شعاعیں بھی کام نہیں کرتیں۔" "انہیں "دیوارِ قید" سے باہر نکالنے کا کام کب کیا جاتا ہے؟" دوسرے ملازم نے پوچھا پہلے نے جواب دیا۔ "علی الصبح..... جب دیوار پتلی ہو جاتی ہے تب یہ کام ممکن ہوتا ہے اور..... جب ہم "دیوارِ قید" میں پھنسی ہوئی اپنی پوری قوم کو باہر نکال لیں گے تو پھر ہمارے پاس اربوں کھربوں کی تعداد میں فوج تیار ہوگی جس کا مقابلہ دُنیا کی بڑی سے بڑی فوج بھی نہ کر سکے گی۔ ..... جدید ٹیکنالوجی تو ہم نے دنیا کے بہترین دماغوں سے حاصل کر ہی لی ہے..... پھر دماغوں میں اُترنے اور پلک جھپکتے میں دیواروں پر چڑھنے کی صلاحیت بھی ہم جلد ہی حاصل کر لیں گے.....!!!"

گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ ملازم کے ہاتھ میں موجود موبائل ٹیلی فون کا بزر ٹوں ٹوں کرنے لگا۔ ملازم نے کچھ دیر تک ٹیلی فون پر کسی سے بات چیت کی پھر اس نے دوسرے ملازم سے کہا۔ "جلدی کرو..... لیبارٹری میں ہمیں طلب کیا گیا ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کا ہاتھ تھاما اور دونوں لمبے لمبے قدم اُٹھاتے وہاں سے چلے گئے ملازموں کے جانے کے بعد جواد پردے سے باہر نکل آیا۔

اس نے دوبارہ بالکونی سے جھانک کر دیکھا لیکن ٹرک اب غائب تھے اور عجیب و غریب بونے

بھی کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ جن کے بارے میں ملازم نے کہا تھا کہ وہ عنقریب دنیا پر قبضہ کر لیں گے۔ تب جواد تیزی کے ساتھ مڑا اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ ملازموں کی عجیب و غریب گفتگو نے جواد کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ ابھی ملازموں کے درمیان ہونے والی گفتگو کی کڑیاں ٹرک سے اُترنے والے بونوں سے ملانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اس کا میزبان ملازم ناشتہ لئے آن دھمکا۔ "جناب! جلدی سے ناشتہ کر لیجئے۔ آپ کو انٹرویو کے مقام پر چھوڑنے کے لئے گاڑی تیار ہے۔"

جواد نے جلدی جلدی ناشتہ کیا پھر ذہنی طور پر خود کو انٹرویو کے لئے تیار کر کے منیجر کے پاس پہنچ گیا۔

"خوش آمدید جواد صاحب! ہم دعا گو ہیں کہ آپ کا انٹرویو ٹھیک ٹھاک ہو جائے حالاں کہ آپ نے ہمارے ہوٹل کی نہایت قیمتی مکڑیاں مار ڈالی ہیں۔"

جواد کے کچھ بولنے سے پہلے ہی منیجر نے کہا۔

"سوری!" جواد شرمندہ سا ہو گیا۔

"میں بہت معذرت خواہ ہوں۔ دراصل میں ان مکڑیوں سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔" پھر جواد نے منیجر کو بتایا کہ "وہ اپنا سفری بیگ اپنے کمرے میں ہی چھوڑے جا رہا ہے کیوں کہ اس کا اسلام آباد میں مزید تین چار روز ٹھہرنے کا پروگرام بن گیا ہے۔" "جیسے آپ کی مرضی جناب!" منیجر نے کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جب آپ کا انٹرویو ختم ہو جائے تو آپ ہوٹل فون کر دیجئے گا ہم گاڑی بھیج دیں گے۔"

"بہت شکریہ جی!..... اب میں چلتا ہوں۔ اجازت!" جواد نے جانے کی اجازت مانگی تو منیجر بولا۔ "ایک منٹ ٹھہریں!" پھر اس نے کسی ملازم کو آواز دے کر کہا۔

"معزز مہمان کے لئے مشروب لاؤ۔" اس کے حکم کی دیر تھی کہ ایک ملازم نہایت ہی نفیس اور خوبصورت شیشے کے گلاس میں لال رنگ کا کوئی مشروب لے آیا جس میں سفید سفید برف کی ڈلیاں تیر رہی تھیں۔

"یہ پی لیجئے..... آپ کا ذہن تر و تازہ رہے گا۔ اور آپ نہایت احسن انداز میں انٹرویو دے سکیں گے۔" منیجر نے کہا۔

جواد نے جھجکتے ہوئے مشروب کا گلاس ہونٹوں سے لگایا تو نہایت تیز خوشبو اس کے ناک کے نتھنوں میں گھس گئی پھر ڈرتے ڈرتے جواد نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ بے حد عجیب و غریب ذائقہ تھا لیکن تھا بہت مزے دار۔

"کیوں جناب! مزا آیا؟" منیجر مسکرایا۔

"ہاں بہت مزے دار ہے۔" جواد نے کہا پھر وہ منیجر سے ہاتھ ملا کر میزبان کے ساتھ پارکنگ لاٹ میں آیا تو ایک نہایت لمبی چوڑی سفید کار کھڑی تھی اور کار کا پچھلا دروازہ کھولے سفید ہی لباس میں

ایک باوردی ڈرائیور بڑی مستعدی کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ ڈرائیور کے ہاتھوں میں سفید دستانے تھے اور آنکھوں پر کالا چشمہ۔ جواد نے کار کی طرف دیکھا تو اس میں آٹھ پہیئے تھے۔

"تشریف رکھئے جناب!" بڑے ملائم لہجے میں ڈرائیور نے کہا۔ پھر جواد کے پچھلے سیٹ میں دھنستے ہی گاڑی جواد کی بتائی ہوئی مطلوبہ جگہ پر دوڑنے لگی۔ گاڑی بڑی تیزی کے ساتھ دوڑی جارہی تھی اور جواد کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہو..... "شاید یہ مشروب کا اثر ہے!" جواد نے سوچا لیکن اسے غنودگی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

آٹھ پہیوں والی کار اسے انٹرویو کے مقام پر چھوڑ کر چلی گئی۔ انٹرویو دینے کافی لوگ آئے ہوئے تھے اور جواد بالکل وقت پر پہنچا تھا۔ انٹرویو خاصا سخت ہو رہا تھا جب اس کی باری آئی تو اسے قطعاً دشواری محسوس نہ ہوئی جو سوالات اس سے پوچھے جارہے تھے وہ خاصے مشکل تھے لیکن جواد فر فر جواب دے رہا تھا پھر تحریری ٹیسٹ ہوا تو اس میں بھی سارے سوالات اسے آسان لگے جب کہ ہال میں پرچہ حل کرتے ہوئے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

انٹرویو دے کر جب جواد باہر نکلا تو سب لوگ اس کی ذہانت اور قابلیت کی تعریف کر رہے ان میں وہ لوگ شامل تھے جنہوں نے انٹرویو لیا تھا۔

جواد بہت خوش تھا۔ اس کی تیاری خاص نہ تھی پھر بھی انٹرویو بہت ٹھیک ٹھاک رہا تھا۔ انٹرویو سے فارغ ہوتے ہی جواد نے پبلک بوتھ سے ہوٹل اسپائیڈر فون کیا تو چند ہی منٹوں میں وہی آٹھ پہیوں والی سفید کار اسے لینے مطلوبہ جگہ آپہنچی۔ جواد کے کار میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے ہرے رنگ کی ایک بوتل جواد کی طرف بڑھائی جس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔

"جناب! انٹرویو دینے سے عموماً ذہنی تھکن ہو جاتی ہے اس مشروب کو پی لیجئے ساری ذہنی تھکن دور ہو جائے گی۔" جواد نے تیز خوشبو والا ہرا مشروب پیا تو اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اس کے آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہونے لگے اور اسے اپنا ذہن تیزی سے اندھیروں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ گاڑی تیزی کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ لیکن اب جواد کو کچھ ہوش نہ تھا.....!!

جب ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک پلیٹ فارم کی بنچ پر لیٹا پایا۔ "میں تو کار میں بیٹھا تھا..... پھر یہ پلیٹ فارم پر کس طرح پہنچ گیا؟" جواد حیرت زدہ ہو کر بنچ سے اُٹھ بیٹھا۔ وہ بڑی حیرانی سے پلیٹ فارم پر آنے جانے والے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت اس کی انگلیوں میں بڑی تیز خارش ہونے لگی۔ جواد تیزی کے ساتھ اُنگلیاں کھجانے لگا ..... ابھی وہ اُنگلیاں کھجا ہی رہا تھا کہ ایک نہایت ہی حیرت انگیز بات ہوئی۔ اس کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں شہادت کی اُنگلی کے برابر سے اور سب سے چھوٹی اُنگلی کے پاس سے ننھی ننھی اُنگلیاں پھوٹنے لگیں ساتھ ہی انگوٹھوں کے پاس سے بھی ایک ایک

ننھا سا انگوٹھا اُگنے لگا۔ یہ ننھی ننھی انگلیاں اور انگوٹھے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہاتھوں کی انگلیوں کے برابر ہو گئے۔

”نن ...... نن ...... نہیں ..... نہیں!!“ جواد چیخ اُٹھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا .... وہ خوف زدہ انداز میں اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا جہاں انگلیوں کی تعداد اب آٹھ ہو گئی تھی۔...آٹھ ...!!! جاری ہے .... اس سنسنی خیز کہانی کے مزید حیرت انگیز اور پر اسرار واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں!!

اسے کہتے ہیں ”کان کھانا“

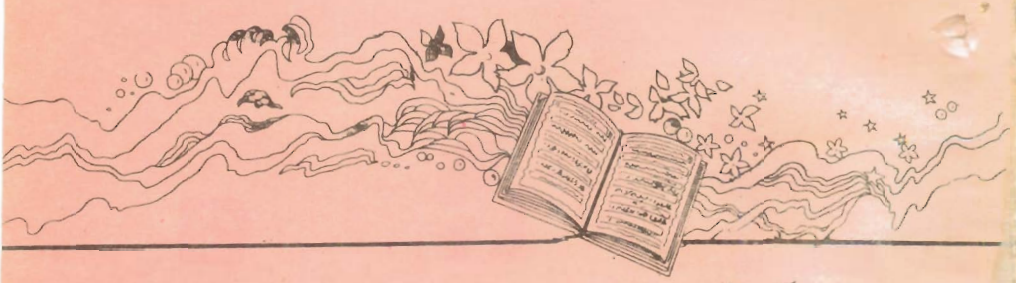

کرنیں

محمد سہیل سلیمان، کراچی

حضرت امام زین العابدینؒ گھر سے جنگل میں تشریف لے گئے۔ وہاں دو نفل ادا کیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے عرض کی۔

"یا اللہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں انگور کھاؤں اور یا اللہ میرے کپڑے پھٹ گئے ہیں۔ مجھے نئے کپڑے بھی عطا فرما۔"

دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے ایک تھال اور ایک ٹوکرا زمین پر اُترا۔ ٹوکرے میں انگور کے خوشے اور تھال میں کپڑے تھے۔

جب حضرت امامؒ نے انگور کھانا شروع کئے تو ایک صاحب نے سلام کے بعد عرض کیا۔ "یا امامؒ! میں بھی حصہ دار ہوں۔" حضرتؒ نے پوچھا "کس طرح؟" اس شخص نے عرض کی "جب آپؒ دعا مانگ رہے تھے میں نے آمین کہا تھا۔"

امامؒ نے انگور کا ٹوکرا اس شخص کو دے دیا۔ شہر میں داخل ہوئے تو ایک شخص نے کہا "یا امامؒ میرے کپڑے بوسیدہ ہو گئے ہیں۔" حضرت امام زین العابدینؒ نے آسمان سے اُتری ہوئی پوشاک اس شخص کو دے دی اور خالی ہاتھ گھر تشریف لے گئے۔

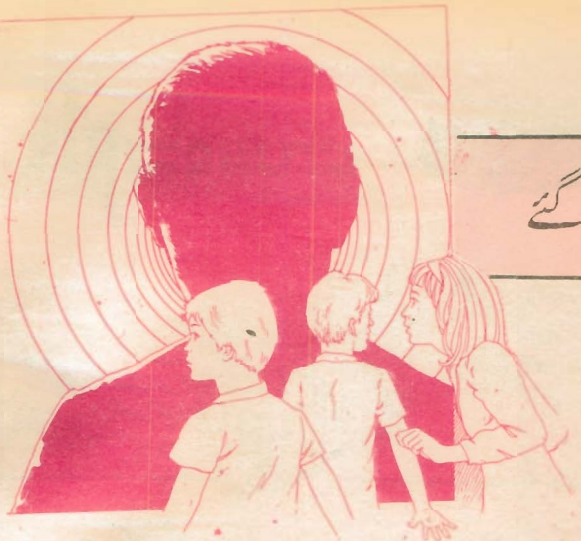

تایا جی مان گئے

سیدہ صدف عرفان

"آج تایا جی آ رہے ہیں۔" ثمرہ نے ہم سب کو اطلاع دی سب کے چہروں پہ خوف بکھر گیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ قید و بند کی صعوبتیں شروع ہونے والی ہیں۔" فارحہ نے ہنکارا بھرا۔

"اور ڈانٹ ڈپٹ کی کلاسز بھی۔" یہ ماہا کی آواز تھی۔ "ہاں ہم سب کی ننھی جانوں پہ سختی آنے والی ہے لہٰذا آؤ اور رات سے پہلے پہلے جس قدر آزادی سے دن گزار سکتے ہو گزار لو۔" ثمرہ نے غمزدہ لہجے میں کہا اور سب ایک دوسرے کو مایوسی سے دیکھنے لگے۔

"تایا جی عجیب و غریب طبیعت کے مالک ہیں سخت مزاج، بچوں سے بدکنے والے، بات بات پر بچوں کو "ڈوز" پلانے کے عادی۔ پہلے وہ ایسے نہیں تھے۔ ہم سب بچوں کے لئے گفٹ لاتے، جنوں پریوں اور حاتم طائی کی کہانیاں سناتے۔ سردیوں کی راتوں میں ہم سب ہیٹر کے آگے بیٹھ جاتے۔ مونگ پھلی کھائی جاتی، چلغوزے ٹونگے جاتے اور خوب لطیفہ بازی ہوتی۔ اس سب ہنگامے میں تایا جی پیش پیش رہتے۔ اس وقت ان کا بیٹا خالد اور بیٹی روحی بھی زندہ تھے۔ تائی جی کا انتقال ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ تایا جی دواؤں کی کمپنی میں ملازمت کرتے تھے۔ ہر سال موسم سرما میں پندرہ دن کی چھٹیاں لے کر ہمارے گھر آتے اور ہمارے مزے آ جاتے تھے۔

مجھے یاد ہے ان دنوں ہم "کون کس کا بچہ" والا کھیل بڑے شوق سے کھیلتے تھے۔ اس کھیل

میں بڑے بھی شامل ہوتے تھے۔ ہر بچے کی کوشش ہوتی کہ کسی طرح وہ تایا جی کا بچہ بن جائے۔ پھر گزرتے وقت نے تایا جی کی زندگی کو دکھوں سے بھر دیا۔ تائی جی تو پہلے ہی فوت ہو گئی تھیں۔ ایک روز خالد اور روحی بھی یہ دنیا چھوڑ گئے ان کی اسکول وین کا ایک ٹرک سے تصادم ہو گیا تھا باقی سب بچے تو بچ گئے لیکن خالد اور روحی .....

یہ واقعہ بہت المناک تھا۔ ابو ان دنوں تایا جی کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ ہم سبھی سہمے ہوئے تھے۔ ابو بھی بہت غمزدہ تھے۔ انہوں نے ایک روز سب سے چھوٹے "ارشد" کو تایا جی کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔ امی اس فیصلے پر خاموش تھیں جب کہ ہم سب یہ چاہتے تھے کہ ننھا "ارشد" ہمارے ساتھ ہی رہے۔

اتفاق سے اسی روز "کون کس کا بچہ" والا کھیل شروع ہو گیا تھا اور ہم سب بہانے بہانے امی، ابو کے بچے بننے لگے تھے فارحہ کو اپنی گڑیا یاد آ گئی جو اسے ابو نے دلوائی تھی۔ فرقان کو سوئیٹر، ثمرہ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ امی ابو کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لئے امی، ابو کی بچی بننا اس کی مجبوری ہے جبکہ ماما ڈر کے کمرے سے بھاگ گئی تھی۔ آخر میں میں اور ارشد بچے تھے میں..... نے ڈرتے ڈرتے تایا جی سے کہا تھا۔

"تایا جی میں آپ کی بچی بن جاتی ہوں۔ میں بڑی ہوں امی، ابو کے بغیر رہ لوں گی لیکن ارشد تو بہت چھوٹا ہے وہ امی، ابو کے بغیر نہیں رہ سکتا اور پھر ہم سب کو بھی وہ بہت یاد آئے گا۔ آپ اسے یہیں رہنے دیں۔ یہیں چھوڑ دیں تایا جی پلیز!" میں نے ملتجی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تو تایا جی نے اسی روز سے ارشد کو تو کیا ہم سب کو ہی چھوڑ دیا۔ وہ تنہا واپس چلے گئے۔ پھر ہر سال وہ آتے رہے لیکن اب وہ پہلے والے تایا جی نہیں رہے تھے۔ وہ سخت گیر، بات بات پہ جھڑکنے والے خوفناک سے تایا جی بن گئے تھے۔

بعد میں ہم نے انہیں منانے کی بہت کوششیں کیں لیکن وہ بچہ پارٹی سے روٹھ گئے تھے اور آج رات وہ پھر آ رہے تھے۔ رات بھی آ گئی لیکن تایا جی نہیں آئے۔ ہم سب بچے خوش تھے لیکن امی ابو پریشان ہو گئے تھے کہ اگر کسی کام سے رکنا پڑا تھا تو اطلاع ہی کر دیتے اور پھر آدھی رات کو ان کی بس الٹنے کی اطلاع ملی ہم سب ساکت رہ گئے۔ بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے۔ زخمیوں کی بھرمار تھی تایا جی بھی وہیں لیٹے ہوئے تھے۔ خون بہت زیادہ ضائع ہو گیا تھا۔ ابو اور تایا جی کا بلڈ گروپ ایک جیسا ہے۔ ابو نے فوراً دو بوتلیں خون دیا۔ خدا خدا کر کے ان کی حالت سنبھلی تو ہم سب واپس گھر لوٹے۔ ابو وہیں رُک گئے تھے۔

کچھ دن بعد تایا جی مکمل صحت یاب ہو کر گھر آ گئے۔ ہم نے ان کے استقبال کی زبردست تیاریاں کی تھیں۔ امی نے مزے مزے کے کھانے پکائے تھے ثمرہ اور میں نے مل کر ان کا کمرہ سیٹ کیا تھا۔ ننھے ارشد نے ننھے ننھے پھولوں کا گلدستہ بنایا تھا۔

تایا جی آئے تو ہم نے یہ گلدستہ انہیں پیش کیا۔ ان کے چہرے کے تاثرات میں کچھ نرمی آئی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو چونک گئے۔ سامنے کی دیوار پر ایک بہت بڑا پوسٹر سا لگا ہوا تھا۔ اس پر تایا جی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ فارحہ کی ڈرائنگ کا کمال تھا اور اس کے ساتھ لکھا تھا۔ ''ہم سب آپ کے بچے ہیں تایا جی! صرف آپ کے بچے۔''

تایا جی تحریر پڑھ کر چونکے۔ ہماری طرف دیکھا۔ ہم سب لپک لپک کر ان کی طرف بڑھے۔ کسی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کسی نے ٹانگ، کوئی ان کے گلے سے لٹک گیا۔ تایا جی بے اختیار ہنس پڑے اور سب بچوں کو گلے سے لگا لیا۔

ہماری ایک غلطی سے وہ ہم سے روٹھ گئے تھے لیکن آج ہماری ہی کوشش سے وہ ایک بار پھر پرانے تایا جی بن گئے تھے، ہنستے مسکراتے تایا جی۔

ہیلو! آپ سُن رہے ہیں

اظہر خان، کراچی

ٹیلیفون وہ آلہ ہے جس کے ذریعے ہم دور بیٹھے اپنا پیغام پہنچا سکتے ہوں۔ مختصراً اسے فون بھی کہتے ہیں۔ ٹیلی فون گراہم بیل کی مفید ایجاد ہے۔ سب سے پہلے فون بڑے بڑے شہر مثلاً کراچی، لاہور، راولپنڈی، پشاور میں لگے جیسے جیسے زمانہ ترقی کی منازل طے کرتا گیا ..... ٹیلیفون سیٹ بھی جدید سے جدید تر ہوتے گئے۔ پہلے پہل جب ٹیلیفون ایجاد ہوا تو ایک ہی طرح کی آواز ہوا کرتی تھی وہ یہ تھی ٹِک ٹِک مگر اب اس میں مختلف آوازیں شامل کی گئی ہیں۔ اکثر گھرانوں میں ٹیلیفون کی سہولت ہے مگر جن لوگوں کہ یہاں ٹیلیفون نہیں ہیں ان کے لئے بھی محکمہ نے سہولتیں رکھیں ہوئی ہیں۔ شہر کے مختلف حصوں میں پبلک کال آفس کھلے ہوئے ہیں۔ جہاں سے آپ فون پیسے دے کر کر سکتے ہیں۔ بعض اوقات غمی خوشی کے ایسے پیغامات پہنچانا ضروری ہوتے ہیں اور وقت کی قلت بھی ہوتی ہے۔ تو ایسے موقع پر فون بہت ہی کار آمد ثابت ہوتا ہے۔ متحدہ ہندوستان میں فون کی سہولتیں تقریباً پینسٹھ سال قبل میسّر آنا شروع ہوئی تھیں۔ اس وقت بڑے، بڑے شہر مثلاً دِلّی، لاہور، شملہ وغیرہ جہاں جہاں پر برطانیہ کے گورنر جنرل اور دوسرے افسران کے دفاتر یا فوجی مراکز میں فون لگائے گئے تھے اس کے بعد یہ سہولتیں تاجر اور امرا کو مل گئیں اور آہستہ آہستہ شہروں کے لوگ بھی اس مُفید ایجاد سے فائدہ اٹھانے لگے۔ ہم نے بھی اس ٹیلی فون پر مضمون لکھا ہے اور اسے بھیجنے کے بعد ایڈیٹر صاحب کو ٹیلی فون کریں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ کیسا لگا آپ کو ہمارا ''ٹیلی فون''!!

سلائی مشین

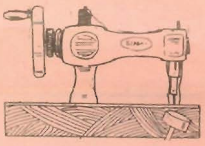

ایم اعجاز احمد، کراچی

اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط سے اکثر موجدوں نے کپڑا سینے کی مشین بنانے کی کوشش کی لیکن اطمینان کے قابل کوئی مشین تیار نہ ہو سکی۔ ۱۷۹۰ میں (ٹامس سینٹ) کی کوشش کامیاب ہوئی اور اس نے ایک کار آمد مشین تیار کر لی ۱۸۶۰ء میں کسی فرانسیسی نے ایک اور مشین بنالی۔ انیسویں صدی کے تقریباً وسط تک اس فن میں کوئی قابل ذکر ترقی نہ ہوئی۔ آخر ۱۸۶۲ء میں امریکہ کے ایک شخص (الیاس ہو) نے بہت کوشش کے بعد ایک مکمل مشین تیار کی لیکن اس میں سوئی آگے اور پیچھے سطح کے ہموار چلتی تھی نہ کہ عموداً جیسے آج کل کی مشینوں میں ہوتا ہے۔ الیاس ہو بمقام سپنسر "ریاست ہائے متحدہ امریکہ" کے ایک غریب پنسارے کے گھر پیدا ہوا۔ سترہ سال کی عمر میں وہ روئی کے ایک کار خانہ میں کام کرنے لگا۔ "۱۸۶۳ء میں اس نے کپڑا سینے کی ایک مشین بنانا شروع کی جو تھوڑے ہی عرصے میں مکمل ہو گئی پھر ایک دوست سے کچھ روپیہ قرض لے کر اس نے رجسٹری کرائی اور لندن چلا گیا جہاں اس نے وہ تقریباً چھ ہزار روپے میں فروخت کر دی۔ اس سے تمام قرضہ اُتر گیا۔ گھر واپس آیا تو جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ بے چارہ مُفلس ہو گیا اور جب اس نے دیکھا کہ بہت سے کارخانہ دار اس کار جسٹری کا حق توڑ کر خود مشین بنا کر بیچ رہے ہیں تو اسے سخت صدمہ ہوا لیکن حوصلہ کر کے ایک دوست کی امداد سے ان سب پر دعویٰ کر دیا جس سے اسے تمام ہر جانہ مل گیا اب "الیاس ہو" نے ایک کارخانہ قائم کر کے مشین کی تجارت شروع کی تو روپیہ مینہ کی طرح برسنے لگا اور چند ہی سال میں وہ اس قدر دولت مند ہو گیا کہ اس کی آمدنی پندرہ بیس لاکھ روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی۔ یہ مشین دائیں ہاتھ سے چلائی جاتی ہے اور بائیں ہاتھ سے کپڑے کا وہ حصہ جس پر سلائی کرنی ہو سوئی کے نیچے لگا تار سرکایا جاتا ہے۔ ایک مشین پاؤں سے بھی چلائی جاتی ہے جو ایک خاص میز پر رکھی جاتی ہے اور چلانے والا کرسی پر بیٹھتا ہے۔ اس سے ایک تو یہ فائدہ ہے کہ دونوں ہاتھوں سے کپڑا اچھی طرح درست کر کے سوئی کے نیچے رکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے رفتار بھی ایک جیسی رہتی ہے۔ بجلی سے چلنے والی مشینیں بھی تیار ہو گئی ہیں مگر یہ بہت مہنگی ہیں۔ آج کل ہمارے ملک شہروں قصبوں بلکہ دیہات میں بھی گھر گھر مشینیں چل رہی ہیں۔ سلائی مشین ایک نہایت اعلیٰ و مفید ایجاد ہے۔

ایک ہی دفعہ خرید لی جائے تو کافی عرصے کے لئے
کپڑے سینے میں آسانی ہو جاتی ہے اور بہت سا
روپیہ بچ جاتا ہے۔ کوٹ اور دوسرے کپڑوں کے

سواجن کا سینا ذرا مشکل ہے باقی قمیضیں، شلوار
وغیرہ عام کپڑے گھر کی عورتیں نہایت آسانی
سے اس پر سی لیتی ہیں!!!

پاکستان

ضیغم حمیدی ایم اے، کراچی

میرا وطن ہے پاکستان اس پر میری جاں قربان
کتنے شہیدوں کا خوں دے کر ہم نے اس کو پایا ہے
کھیتوں میں ہریالی ہے اور راہوں میں اجیالا ہے
یہ ہے قدرت کا احسان
میرا وطن ہے پاکستان
اس پر میری جاں قربان
سندھی، بلوچی اور پنجابی، سرحد کے غیور پٹھان
سب کچھ ان کا ایک ہی پیارے، ایک خدا ہے اک قرآن
ایک جیسا ان کا ایمان
میرا وطن ہے پاکستان
اس پر میری جاں قربان
سارے پاکستانی مل کر اس کی شان بڑھاتے ہیں
سوہنی سوہنی پیاری دھرتی کو زرخیز بناتے ہیں
وہ مزدور ہوں یا دہقان
میرا وطن ہے پاکستان
اس پر میری جاں قربان

سفر ہو رہا ہے

ضمیر جعفری

جو خوش پوش گیسو سنوارے ہوئے تھا
بہت مال چہرے پہ مارے ہوئے تھا
بڑا قیمتی سوٹ دھارے ہوئے تھا
گھڑی بھر میں سب کچھ اُتارے ہوئے تھا
بے چارے کا حُلیہ دگر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

جو گردن میں کالر تھا "ر" رہ گیا ہے
ٹماٹر کے تھیلے میں "ٹر" رہ گیا ہے
خدا جانے مُرغا کِدھر رہ گیا ہے
بغل میں تو بس اک "پر" رہ گیا ہے
سفر ہر قدم پُر خطر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

انتخاب ..... صائمہ شاد، کراچی

شیطانی لاش

وسیم بن ضمیر

کامران صاحب جو کہ ایک بڑے سائنس دان تھے، برسوں سے ایک لاش کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو ان کے اشاروں پر چلے۔ آج برسوں کے بعد ان کی محنت رنگ لائی تھی۔ اور وہ اپنے تجربے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اپنی امی کی آواز پر وہ اپنی تجربہ گاہ سے نکل کر باہر گئے وہاں سب رات کے کھانے پر ان کا انتظار کر رہے تھے۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔ پھر کامران صاحب اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ ان کے اس تجربے کے بارے میں گھر میں بھی کسی کو نہیں معلوم تھا۔ جب گھر کے سب افراد سو گئے تو وہ دوبارہ اپنی تجربہ گاہ میں گئے اور اور ری موٹ نکال کر بٹن دبایا۔ جس کے دبتے ہی الماری کا دروازہ کھلا اور لاش باہر نکل آئی۔ یہ لاش کسی بہت ہی لحیم شحیم آدمی کی تھی جسے دیکھنے سے ہی خوف آتا تھا پھر کامران صاحب نے تو مختلف تبدیلیاں کر کے اسے اور بھی زیادہ خوفناک بنا دیا تھا۔ کامران صاحب دیر تک لاش کو مختلف حکم دے کر لطف اندوز ہوتے رہے پھر تھک کر اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔ صبح ناشتے کے بعد کامران صاحب اپنے گھر کے لئے کچھ ضروری سامان لینے چلے گئے تو ان کے پیچھے ان کا بیٹا پپو تجربہ گاہ میں چلا گیا وہاں اسے کچھ اور تو نہیں ملا وہ ریموٹ سے کھیلنے لگا۔ اس کے بٹن دباتے ہی الماری کا دروازہ کھلا اور اس میں سے لاش باہر نکل آئی جسے دیکھ کر پپو فوراً بے ہوش ہو گیا۔ اب لاش کنٹرول سے باہر ہو گئی تھی۔ اس نے تجربہ گاہ کا سامان توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا پھر زمین پر

پڑے ہوئے پپو کا خون چوس کر باہر نکل آئی۔ باہر آکر اس نے گھر کا سامان باقی توڑا اور کچن میں موجود کامران صاحب کی بیوی کا خون پی لیا پھر لاش گھر سے باہر نکل آئی اور بازار میں پہنچ گئی تو اسے دیکھ کو لوگ بھاگنا شروع ہو گئے۔ بہت سے لوگ ڈر کے مارے بے ہوش ہو گئے۔ لاش نے بہت سے لوگوں کو مار ڈالا۔ اب وہ کامران صاحب کے کمرے میں پہنچ گئی۔ جو تمام ہنگاموں سے بے نیاز بے خبر سو رہے تھے۔ لاش نے کامران صاحب کو گلے سے پکڑ لیا اور پھر زمین پر زور سے پٹخا تو کامران صاحب کی آنکھ کھل گئی۔

"اف! کتنا بھیانک خواب تھا؟" کامران صاحب بڑبڑائے پھر جلدی سے اٹھ کر وہ الماری تک گئے۔ لاش الماری میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔

اس خواب کے بعد کامران صاحب نے لاش پر تجربات بند کر دیئے!!

دعا

شاعر۔ علامہ اقبال

یارب دلِ مُسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرّے کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشہ دے پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشہ کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دِکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو
سینوں میں اُجالا کر، دل صورتِ مینا دے
میں بُلبلِ نالاں ہوں اک اُجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا! دے

انتخاب، نوشین شیخ

عبدالقدیر انڈھڑ
بنوں عاقل

ستارہ جگمگاتا رہے گا

کرکٹ کی دنیا میں کئی ستارے چمکے اور پھر چمک کر بجھ گئے لیکن ایک ستارہ ہے جس کے کارناموں سے کرکٹ کا افق ابھی تک جگمگا رہا ہے۔ یہ ستارہ ہے سرڈان بریڈ مین کا یہ سر کا لقب پانے والے سر ڈان بریڈ مین ۲۷ اگست ۱۹۰۸ء کو نیو ساؤتھ ویلز میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد (آسٹریلیا) کے ایک کسان تھے جو بعد میں ایک بڑھئی بنے۔

سرڈان بریڈ مین نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز پانچ برس کی عمر سے کیا۔ سر بریڈ مین نے ۲۹-۱۹۲۸ء کے سیزن میں پہلا ٹیسٹ کھیلا جس میں وہ صرف اٹھارہ اور ایک رن بنا سکے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے ایسے کارنامے سر انجام دیئے کہ نصف صدی تک اسے کوئی بھی توڑ نہیں سکا۔ سوبرز نے بیٹنگ میں بڑا نام کمایا، بائیکاٹ آئیڈیل بیٹس مین کہلائے، میانداد نے عظیم کارنامے انجام دیئے، گاور نے بیٹنگ کو خوبصورت رنگ دیئے، گواسکر نے رنز کے انبار لگا دیئے، بارڈر نے کرکٹ کی ۱۰۰ سالہ تاریخ کو پیچھے چھوڑ دیا...... مگر آج تک کوئی بھی سرڈان بریڈ مین کے کارناموں کو دھندلا نہ سکا ہے۔

سرڈان بریڈ مین نے ۲۹-۱۹۲۸ سے لے کر ۱۹۴۸ء تک ۲۰ برسوں میں آسٹریلیا کی طرف سے ۵۷ ٹیسٹ میچوں میں حصہ لیا اور ۸۰ اننگز میں ۱۰ مرتبہ ناٹ آؤٹ رہتے ہوئے ۹۹.۹۴ کی اوسط سے ۶۹۹۶ رنز بنائے جس میں ۲۹ سنچریاں اور ۱۳ نصف سنچریاں شامل تھی۔ ۳۳۴ ان کا بہترین اسکور تھا جو انہوں نے انگلینڈ کے خلاف ۱۹۳۰ء میں لیڈز پہ بنایا۔ ۷ مرتبہ صفر پہ آؤٹ ہوئے۔ ۳۲ کیچز لئے، ۷۲ رنز دے کر ۳۶۰۰ کی اوسط سے ۲ وکٹیں حاصل کیں۔ جس میں ۸ رنز کے عوض ایک وکٹ ان کی بہترین کارکردگی تھی۔ جبکہ ۲۴ ٹیسٹ میچوں میں ڈان بریڈ مین نے اپنی ٹیم کی قیادت کی جس میں سے ۱۵ جیتے ۳ ہارے اور بقیہ ۶ برابر رہے۔

عالمی کرکٹ ہمیشہ ڈان کے کارناموں سے منور رہے گی اور کرکٹ کی ریکارڈ بکس میں ان کا نام ہمیشہ سرفہرست کھلاڑیوں میں شامل رہے گا۔ !!

پاکستان بنایا جس نے

مرسلہ

عشرت بانو ریاض احمد، کراچی

پاکستان بنایا جس نے
روشن دن دکھایا جس نے

ہم ہیں آن سے رہنے والے
ہم کو یہ بتایا جس نے

دشمن کی چالوں کو سمجھا
باطل کو مٹایا جس نے

ہمارے لئے اللہ ہے کافی
ہم کو یہ سمجھایا جس نے

جس پر ہے چاند ستارہ
وہ پرچم لہرایا جس نے

ویرانی کا ٹکڑا تھا یہ
گلشن خوب سجایا جس نے

تو ہے سارے قوم کا بابا
گوہر پیار کا پایا جس نے

سائنس کارنر

کیا ہم مینہ برسا سکتے ہیں؟

نوشابہ اکرم، رحیم یار خان۔

اگر بارش نہ ہو اور کھیتیاں سوکھ جانے کا خطرہ ہو تو سائنس دان خود بارش برسا لیتے ہیں لیکن اس کے لئے ہوا میں بادلوں کا ہونا ضروری ہے۔

سائنس دان ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بادلوں کے اوپر جاتے ہیں اور ان پر چند کیمیائی اشیا یا خشک پاؤڈر چھڑکتے ہیں اس سے بادل بھاری ہو جاتے ہیں اور ادھر ادھر نہیں جا سکتے اور وہیں برسنے لگتے ہیں۔

دو مہینے قبر میں

مرتضیٰ رضوی، کراچی۔

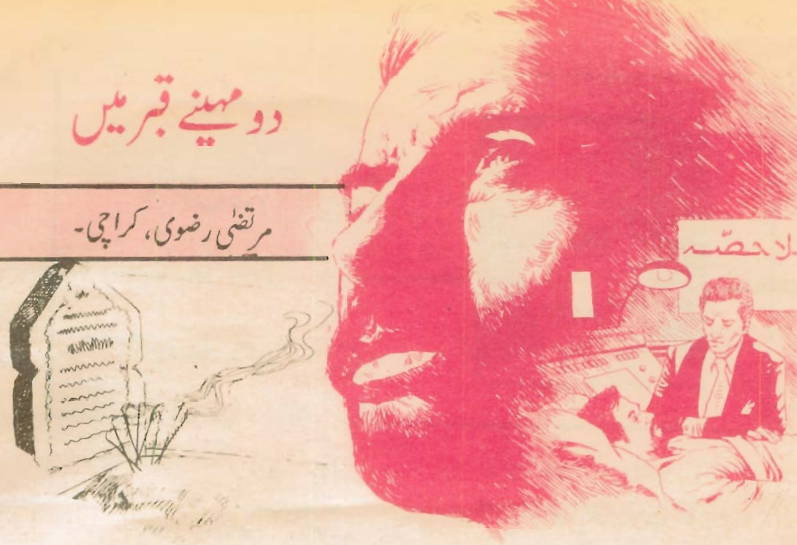

۱۹۶۲ء میں فرانس کے ایک شخص مائیکل سفرے نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ کتنے عرصے زیر زمین زندہ رہ سکتا ہے ایک غار میں جانے کا ارادہ کیا۔ اس نے اس مقصد کے لئے کوہ الپس پر برف سے ڈھکے ہوئے ہوئے تین سو پچھتر فٹ گہرے غار کو منتخب کیا۔

سفرے کے اس تجربے سے سائنس دانوں کو بھی دلچسپی تھی۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ سورج کی روشنی کے بغیر مسلسل تاریکی نقطہ انجماد سے کم درجہ حرارت، تنہائی اور وقت معلوم کرنے کے کسی بھی آلے کے بغیر زندگی گزارنے کے کسی انسان پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس تجربے کے دوران سفرے کا سطح زمین پر واقع امدادی کیمپ سے ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ قائم رہنا تھا۔ مگر اس کیمپ کے ارکان کو یہ ہدایت تھی کہ وہ کم سے کم ایک مہینے تک اس غار میں داخل نہ ہوں گے۔

مائیکل سفرے نے اپنی گھڑی دیکھی اور پھر اسے اپنے دوستوں کو دے دیا۔ یہ ۱۶ جولائی کا دن تھا اور دوپہر کے دو بجنے میں دس منٹ تھے۔ وہ جان بوجھ کر گھڑی اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا تھا کیونکہ وہ دوسری باتوں کے علاوہ یہ اندازہ بھی لگانا چاہتا تھا کہ مسلسل تاریکی میں اسے وقت گزرنے کا احساس کس طرح ہو گا؟

سفرے نے دو مہینے تک اس غار میں زندگی گزارنے کے لئے آہستہ آہستہ نیچے اترنا شروع

کیا۔ شروع میں تو سورج کی کچھ نہ کچھ روشنی اس تک پہنچتی رہی مگر جیسے جیسے وہ نیچے اترتا گیا..... تاریکی پھیلتی گئی اور گلیشیر تک پہنچتے پہنچتے سورج کی آخری کرن بھی غائب ہو گئی۔

گلیشیر پر سفرے کے لئے ایک خیمہ پہلے سے لگا دیا گیا تھا۔ آٹھ فٹ چوڑے اور تیرہ فٹ لمبے اس خیمے میں ایک بستر، ایک میز کرسی، گیس سے جلنے والا چولہا اور روشنی کے لئے بیٹریاں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ سطح زمین پر موجود امدادی کیمپ سے رابطے کے لئے دو ٹیلی فون بھی وہاں رکھ دیئے گئے تھے۔

شروع شروع میں تو سفرے کے کانوں میں اس کے دوستوں کی باتیں گھومتی رہی لیکن جب یہ آوازیں غائب ہو گئی تو اسے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ یہ بات ناممکن تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کی مدد کے بغیر اس غار سے نکل سکے مگر اس کے ساتھی تو دو مہینے کے بعد ہی اسے لینے آئیں گے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کو کوئی حادثہ پیش آ گیا؟ یا اس کا ہاتھ یا پاؤں ٹوٹ گیا تو کیا ہو گا؟ خون کو جما دینے والی سردی اور نمی اس کے پھیپھڑوں اور دل کو شدید نقصان پہنچا سکتی ہے!! تنہائی کی وجہ سے وہ پاگل بھی ہو سکتا ہے!!

اس تجربے میں پائی جانے والی ابتدائی دلچسپی اور مصروفیت سے اکتا کر سفرے اپنے سونے کے تھیلے (سلیپنگ بیگ) میں لیٹ گیا اور پھر اسے نیند نے آلیا تھوڑی ہی دیر بعد اسکی آنکھ کھل گئی تو اس نے دیکھا کہ خیمے کے نیچے جو کینوس بچھا ہے وہ برف کے پانی سے گیلا ہو چکا ہے۔ اس نے فوری طور پر اپنے جوتے اور کپڑے وہاں سے ہٹائے اور انہیں محفوظ مقام پر رکھ دیا۔

سفرے کو پھر بھوک لگنے لگی۔ اس نے تھوڑا سا کوکو گرم کر کے پیا اور پھر اپنا سامان ٹھیک کرنے لگا اس کے ہر قسم کے آلات، خوراک، کتابیں، ایک کیمرہ، ایک ٹیپ ریکارڈر اور ایک ریکارڈ پلیئر موجود تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موسیقی تنہائی کے ان طویل لمحات کو گزارنے میں مدد گار ثابت ہو گی مگر تھوڑی ہی دیر بعد اس کا دل موسیقی سے اکتا گیا۔ حد یہ کہ اس کا پسندیدہ ترین ریکارڈ اسے برا محسوس ہونے لگا۔

سفرے کے پاس ایک ڈائری تھی جس میں وہ اپنی مصروفیات کو درج کرتا تھا۔ مگر ایک وقت ایسا آیا کہ ---------!! (باقی آئندہ)

ننھا ایٹم

ایٹم اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ آپ اس کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتے اگر آپ اسے گننے کرنا شروع کریں اور آخر تک گنتے چلے جائیں تب بھی آپ جتنے ایٹموں کو گن سکیں گے ان سے سوئی کی نوک بھی نہ چھپ سکے گی۔

مرسلہ ..... عمران خالق، کراچی

مجھے یہ شعر پسند ہے

مجھ سے امیرِ شہر کا ہو گا نہ احترام
میری زباں کے واسطے تالے خرید لو
مرسلہ..... محمد اختر سردار، کسووال۔

مجھے تعلیم دی ہے میری فطرت نے یہ بچپن سے
کوئی روئے تو آنسو پونچھ دینا اپنے دامن سے
مرسلہ..... نشاط رینہ، ملتان۔

دوست ملتے ہیں تو کترا کر گزر جاتے ہیں
ہم نے کیا آئینہ ہاتھوں میں اُٹھا رکھا ہے
مرسلہ..... سید محمد عابد حسن زیدی، پرانا سکھر۔

چار دن کی دوستی ہے زمانے میں رواج
کسی توقع پر کسی سے آشنائی کیجئے
مرسلہ..... محمد یوسف بادل، ملتان۔

ایٹم بم ایجاد، مظفر انسان کی
اور کیڑے تخلیق ریشم کرتے ہیں
مرسلہ..... منصور الرشید، اسلام آباد۔

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
مرسلہ..... طارق رفیق بھٹی، اوکاڑہ۔

زمین، دودھ، ہوا، چاندی، شفق، شبنم
کوئی نہیں جسے کہہ دوں کہ ماؤں جیسا ہے
مرسلہ..... طارق رفیق بھٹی، اوکاڑہ۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
مرسلہ..... بتول فاطمہ، کراچی۔

ہمت ہے تو پیدا کر فردوسِ بریں لینا
مانگی ہوئی جنت سے ہے دوزخ کا عذاب اچھا
مرسلہ..... بتول فاطمہ، کراچی۔

ہے یہی میری نماز یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
مرسلہ..... بتول فاطمہ، کراچی۔

ٹھکانہ گور ہے تیرا، عبادت کچھ تو کر غافل
کہاوت ہے کہ خالی ہاتھ گھر جایا نہیں کرتے
مرسلہ..... عفت فاطمہ عفی، راولپنڈی۔

پڑھنا ہے تو انسانوں کو پڑھنے کا ہنر سیکھ
ہر چہرے پر لکھا ہے کتابوں سے زیادہ
مرسلہ..... عفت فاطمہ عفی، راولپنڈی۔

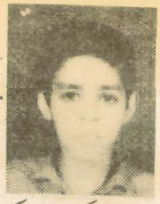

مرسلہ: محمد عدنان، کراچی

۔ پاکستان کے پہلے وزیرِ مواصلات سردار عبدالرب نشتر تھے۔

۔ پاکستان کے پہلے وزیرِ خزانہ غلام محمد تھے۔

۔ پاکستان کے پہلے ایڈووکیٹ جنرل مسٹر ولیم تھے۔

۔ پاکستان کے پہلے وزیرِ داخلہ کا نام خواجہ شہاب ین تھا۔

۔ پاکستان کے پہلے وزیرِ زراعت پیرزادہ عبدالستار تھے۔

مرسلہ: گل محمد خسوری، گھکر

○ ۔ بڑا بھائی باپ کی جگہ ہے

○ ۔ استادوں کی توقیر کرو۔

○ ۔ برا ساتھی گویا آگ کا ٹکڑا ہے۔

○ ۔ اپنی غلطی کا اقرار بلا تامّل کر لو۔

○ ۔ مُسکرانا اللہ کو پسند ہے۔

○ ۔ بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے والا دوزخ میں جائے گا۔

○ ۔ اعمال میں میانہ روی اختیار کرو۔

○ ۔ لوگو! جھوٹی شہادت شرک کے برابر ہے۔

خوشبو

مرسلہ: محمد راشد، کراچی

کہتے ہیں کہ برطانیہ کے ہر باشندے کے خون میں سمندر رچا بسا ہے دراصل جزائر برطانیہ کا ہر شہر اور گاؤں سمندر سے زیادہ سے زیادہ پچھتّر میل کے فاصلے پر ہے جس وقت طوفانی کیفیت ہوتی ہے تو سمندر کی پھوار دور دراز اندرونی علاقوں تک پہنچ جاتی ہے۔

مرسلہ: رضوان حسین، کراچی

○ ۔ اگر آنکھیں روشن ہیں تو ہر روز روزِ محشر ہے۔

○ ۔ مایوسی انسان کی سب سے بڑی دشمن اور خدا کا عذاب ہے۔

○ ۔ دنیا میں سچّا پیار اور سچّی محبت صرف خدا سے کرو یقیناً تمہیں راحت اور سکون ملے گا۔

آخری بات

محمد سلیم امام، متحدہ امارات

آسمان سے پانی کا ایک قطرہ ایک ندی میں گرا اور دوسرے قطروں کے ساتھ مل گیا۔ پانی نے ڈھلوان کی جانب بہنا شروع کیا اور اپنے سامنے آنے والی رکاوٹوں کو عبور کرتا مختلف ندیوں نالوں سے گزرا پھر دریا میں جا گرا۔ دریا کا پانی سفر کرتا ہوا سمندر میں جا پہنچا تو تمام رکاوٹیں اس کے اندر غرق ہو گئیں۔

آسمان سے گرنے والا وہ حقیر سا قطرہ اب ٹھاٹھیں مارتا ایک عظیم سمندر تھا جس کی طاقت بے پناہ بڑھ گئی تھی جو، اب اپنے سامنے آنے والی رکاوٹوں کو تہس نہس کر سکتا تھا۔

ایک قطرے کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن جب بہت سے قطرے مل جائیں تو ایک طاقت بن جاتے ہیں، دریا کا دھارا بہہ نکلتا ہے، سمندر کی وسعت بن جاتے ہیں اور آنے والی رکاوٹیں ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

آج مسلمان الگ الگ قطروں کی صورت میں علیحدہ علیحدہ راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ ہمارا راستہ، ہماری منزل ایک ہے۔ ہمیں اس راستے پر چلنے کے لئے ایک ہو کر چلنا ہو گا۔ یہ راستہ ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب کا راستہ ہے۔ اس راستے پر ثابت قدمی سے ہم اسی وقت چل سکتے ہیں جب آپس میں تمام تعصبات، رنجشیں، اختلافات، نفرتیں اور کدورتوں کو مٹا دیں اور قرآن و سنت کا طریقہ اختیار کر لیں اگر ہمیں متحد ہونا ہے تو پہلے اس راستے کا انتخاب کرنا ہو گا۔

بے شک یہ راستہ بڑا کٹھن ہے ...... اس میں جگہ جگہ رکاوٹیں ہیں لیکن ہمارے اتحاد کی طاقت ہمیں وہ قوت بخشے گی جو ایک مومن کے ایمان کا خاصہ ہے اور جب ایسے ہی کئی مومن اتحاد و ایمان اور تنظیم کی لڑی میں شامل ہو جائیں گے تو وہ تاریخ کا دھارا بن جائیں گے جو اپنی راہ میں آنے والی ہر برائی کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ آیئے! ایسے ہی مومن بنیں!!

تاریخ ایسے مومنوں کا نام سنہرے حرفوں سے لکھے گی!!

کیچپ تو صِرف

احمد

ٹماٹو کیچپ

REGD. No. M-266 AUGUST 1994
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI